جناب پرویز مشرف

السلام علیکم

میرا پہلے بھی یہ گمان تھا کہ آپ پاکستان کے ساتھ مخلص ہیں' اور پاکستان کے استحکام اور بہبودی کے دل سے خواہشمند ہیں' اور آپ کی 9 اپریل والی تقریر سے یہ گمان مزید مستحکم ہو گیا ہے ـــــ نیز آپ کے مختلف اصلاحی اقدامات سے ممکن ہے کہ عارضی طور پر پاکستان مستحکم بھی ہو جائے اور خوشحال بھی!

لیکن

چونکہ آپ اسلام کو صرف انفرادی زندگی سے متعلق' اور عقائد و عبادات پر مشتمل ''مذہب'' کی حیثیت سے مانتے ہیں' مکمل دستوری و قانونی نظام اور معاشرت' معیشت اور امور مملکت پر مشتمل نظامِ عدل اجتماعی یا ''دین حق'' کی حیثیت سے نہیں' بنا بریں آپ کی حکومت کے تسلسل سے قوی اندیشہ ہے کہ پاکستان سیکولرازم کی جانب فیصلہ کن طور پر بڑھ جائے گا۔

لہذا

میں اپنے اسلام اور پاکستان کے ساتھ خلوص و محبت اور خود آپ کی خیر خواہی کی بنا پر لازم سمجھتا ہوں کہ آپ کو متنبہ کر دوں کہ بالآخر اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ پاکستان اپنا جداگانہ وجود برقرار نہیں رکھ سکے گا اور بھارت میں مدغم ہو جائے گا ـــ اس لئے کہ ایک سیکولر پاکستان اپنے بقا کی واحد وجہ جواز (raison d`etre) سے محروم ہو جائے گا! اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام بد سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے' آمین ثم آمین

خدارا اِس معاملے پر سنجیدگی سے

فقط والسلام
خادم قرآن واسلام

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی
وداعی تحریک خلافت پاکستان

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر کے نام

امیر تنظیم اسلامی کا پیغام

جو اخباری اشتہار کی صورت میں

۱۱ اپریل کو قومی اخبارات میں شائع ہوا

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اُوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد:	۵۱
شمارہ:	۵
ربیع الاول	۱۴۲۳ھ
مئی	۲۰۰۲ء
فی شمارہ	-/۱۲

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

☆ اندرون ملک	125 روپے
☆ ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ	800 روپے
☆ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ	1000 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36-کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700' فون 5869501-02-03
فیکس: 5834000 ای میل: anjuman@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67-گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور
فون: 6316638-6366638 فیکس: 6305110
ای میل: markaz@tanzeem.org

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ **عرض احوال** ـــــــــــ ۳

حافظ عاکف سعید

☆ **دعوت فکر** ـــــــــــ ۶

قومی اخبارات کو جاری کردہ تین اشتہارات

از: ڈاکٹر اسرار احمد

☆ **حقیقت دین** ـــــــــــ ۹

مسئلہ شفاعت' بحوالہ درس آیۃ الکرسی

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ **فکر اقبال** ـــــــــــ ۴۷

ملتِ بیضاء پر ایک عُمرانی نظر

علامہ شیخ محمد اقبال

☆ **اسلامی معاشرت** ـــــــــــ ۷۲

آزادیٔ نسواں کی صدائے بازگشت

محمد آصف احسان عبدالباقی

☆

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

عرض احوال

اندرون ملک ان دنوں ریفرنڈم کا شور وغوغا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ صدر پرویز مشرف سے لے کر ایک عام سرکاری ملازم تک پوری سرکاری مشینری اپنے گرد وپیش سے لا تعلق ہو کر ''ریفرنڈم مہم'' کے لئے دن رات ایک کئے ہوئے ہے۔ سیاسی وفوجی ہر اعتبار سے اس ملک میں قوت واختیار کا ارتکاز پہلے ہی مکمل طور پر پرویز مشرف کی ذات میں تھا اور وہ اس صورت حال کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مطلق العنان فرمانروا کی مانند کوس لمن الملک بجا رہے تھے' لیکن اب وہ ایک حقیقی عوامی لیڈر کے روپ میں نظر آنے کے خواہاں بھی دکھائے دیتے ہیں۔ تاہم یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ ان کا یہ ارمان پورا ہو سکے گا یا نہیں!_____

ہمیں اصل تشویش اس حوالے سے ہے کہ صدر مشرف جس عریاں سیکولرازم کی جانب پاکستان کو لے جانا چاہتے ہیں وہ انجام کار کے اعتبار سے پاکستان کے حق میں سم قاتل ثابت ہوگا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اسلام کے نام پر بننے والا یہ ملک پہلے ہی سیکولرازم کی راہ پر گامزن ہے۔ بے نظیر ہوں یا نواز شریف' دونوں نے اس ملک کی اساس یعنی اسلام کو مضبوط کرنے کی بجائے سیکولرازم کے فروغ میں اپنا اپنا حصہ ڈالا لیکن صدر مشرف جس سرعت کے ساتھ اس ملک کی گاڑی کو عریاں سیکولرازم کی راہ پر دوڑانا چاہتے ہیں وہ یقیناً قابل تشویش ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کی اساس اور بنیاد اسلام کے سوا اور کوئی نہیں ہے جبکہ ابلیس کا عطا کردہ مغربی سیکولر نظام' اسلام کی ضد ہے۔ چنانچہ یہاں سیکولرازم کا فروغ دراصل اس ملک کے وجہِ جواز کو کھونے کے مترادف ہے' جس کے بعد اس کی بقا اور سالمیت کا معاملہ شدید طور پر معرض خطر میں آ جاتا ہے۔ **اللھم اعذنا من ذلک**

بین الاقوامی اعتبار سے اس وقت گرم ترین اور سنگین ترین معاملہ فلسطین کا ہے۔ شیرون اب کھل کر فلسطینی مسلمانوں کے خلاف چنگیز خان اور ہٹلر کا کردار ادا کر رہا ہے۔ وہ امریکہ سمیت کسی عالمی طاقت کی بات ماننے کو تیار نہیں ہے اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ فلسطینیوں کا قتل عام کر رہا ہے۔ یہ صورتِ حال پورے عالم اسلام کے لئے انتہائی تشویش کا باعث ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ امریکہ سمیت پورے فرنگ کی رگِ جان پر اسرائیل کا شکنجہ اس درجے مضبوط ہے کہ اس کی دھونس' دھاندلی' ناانصافی' دحشت وبربریت اور ظالمانہ اقدامات کو روکنے کی کسی میں جرأت ہے نہ طاقت!

ملکی اور بین الاقوامی صورتِ حال پر امیر تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد کے مؤقف وتبصرے سے آگاہی کی خاطر ذیل میں دو خطاباتِ جمعہ کی تلخیص پیش خدمت ہے۔

۱۲/اپریل کے خطابِ جمعہ کی تلخیص

امریکہ کی سرپرستی میں اسرائیل کی کوشش ہے کہ فلسطینی مسلمانوں کی نسل کشی کے ذریعے ان کی قوت مزاحمت کو ختم کر دیا جائے اور باقی بچ رہنے والے مسلمانوں کو غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جائے۔ شیرون پر گریٹر اسرائیل کے قیام کا جنون سوار ہے' وجہ یہ ہے کہ امریکہ کی پشت پناہی کے باعث اسرائیل ایک بہت بڑی جنگی قوت بن چکا ہے' عالم عرب کے تمام بڑے شہر اسرائیل نے اپنے ایٹمی میزائلوں کے نشانے پر رکھے ہوئے ہیں۔ اسرائیل کو عربوں یا عالم اسلام سے کوئی خوف پہلے تھا نہ اب ہے اور اب اس کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ وہ عالم کفر کی اپیلوں کو بھی مسترد کر کے فلسطینی مسلمانوں پر فوج کشی جاری رکھے ہوئے ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسرائیل خود عالمی جنگ شروع کرنے کا خواہاں ہے۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں اس آخری شوڈاؤن کا وقت بہت قریب ہے جس کی خبریں احادیث میں دی گئی ہیں۔ میرے نزدیک اگرچہ اس بڑی جنگ میں عربوں کو آزادی کے بعد دین اسلام قائم نہ کرنے اور اللہ کی بجائے واشنگٹن یا ماسکو کو اپنا قبلہ بنانے کی پاداش میں سزا کے طور پر بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا' تاہم اس معرکۂ حق و باطل میں آخری فتح مسلمانوں اور اسلام ہی کو حاصل ہوگی۔ واضح رہے کہ عربوں کے بعد دین اسلام سے غداری کے دوسرے بڑے مجرم ہم پاکستانی مسلمان ہیں' جنہوں نے اسلام کے نام پر یہ ملک حاصل کیا اور اب تک یہاں اسلامی نظام قائم کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔

صدر پرویز مشرف کے بارے میں اگرچہ یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ پاکستان کی خوشحالی اور استحکام کے دل سے خواہاں ہیں لیکن اس کے لئے وہ ''چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر'' کے اصول کے مطابق ملک کو دوٹوک انداز میں عریاں سیکولرازم کی راہ پر گامزن رکھنے کا عزم مصمم کئے ہوئے ہیں۔ شاید انہیں یہ معلوم نہیں کہ ''اسلام'' کو پاکستان کی بنیاد اور اساس ہی کی نہیں واحد وجۂ جواز کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ بالفرض اگر سیکولر پاکستان وقتی طور پر مستحکم اور خوشحال ہو بھی جائے تو بھی یہ اپنا جداگانہ وجود برقرار نہیں رکھ سکے گا اور بھارت میں مدغم ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ منطقی بات ہے کہ اگر پاکستان میں بھی وہی سیکولر نظام ہو جو بھارت میں ہے تو علیحدہ ملک کے قیام کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ موجودہ حکومت کی یہ روش پاکستان کے وجود اور مستقبل کے اعتبار سے انتہائی خطرناک ہے۔ صدر مشرف کو اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حالیہ ریفرنڈم آئین کی خلاف ورزی کے مترادف ہے' انہیں چاہئے کہ اعلیٰ عدالتوں سے رجوع کریں۔ تاہم صدر مشرف کے ارادوں اور تیاریوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ریفرنڈم ضرور کرائیں گے۔ لہٰذا مخالفت سے یہ ملتوی ہوتا نظر نہیں آتا جبکہ بائیکاٹ سے الٹا نقصان ہو گا۔ اس ضمن میں دینی طبقات کے لئے درست طرز عمل شاید یہ ہوگا کہ ریفرنڈم میں پوچھے گئے سوال کی نفی والے زیادہ سے زیادہ ووٹ کاسٹ کرائے جائیں تاکہ معلوم ہو کہ کتنے فی صد لوگ حکومت کی

پالیسیوں کے تسلسل کے خلاف ہیں۔ اگر چہ جس طرح سرکاری مشینری کے بل پر مینار پاکستان کا جلسہ ہوا ہے' توقع ہے کہ یہ ریفرنڈم بھی ایسا ہی ہوگا تاہم جنرل ضیاء کے ریفرنڈم کی طرح یہ بودا اور محض خانہ پری کا ریفرنڈم نہیں ہوگا۔ کیونکہ جنرل ضیاء کے سوال کے مقابلے میں مشرف کا سوال کافی واضح ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ جنرل ضیاء نے اپنی ریفرنڈم مہم کے لئے عوامی جلسے نہیں کرائے تھے۔ لہٰذا محسوس ہوتا ہے کہ اس بار ریفرنڈم کے موقع پر کافی گہما گہمی ہوگی۔ اگر کوئی ووٹ ڈالنے نہ بھی آیا تو بعید نہیں کہ بعد میں فرشتے ہی ووٹ ڈال جائیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ صدر مشرف نے کہہ دیا ہے کہ اگر میں نے ہارنا ہوتا تو ریفرنڈم ہی کیوں کراتا۔

موجودہ حالات میں دینی جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ خالص دینی جماعتوں کا محاذ قائم کریں اور اپنا ایک اسلامی منشور تیار کر کے حکومت کے سامنے اس پر عمل کرنے کا مطالبہ رکھیں۔ لیکن افسوس بظاہر ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔

۱۹/اپریل کے خطابِ جمعہ کی تلخیص

مشرق وسطیٰ کی صورت حال ایک ایسے آتش فشاں سے مشابہ ہے جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ اگر چہ اس دھماکے میں ابتدائی طور پر اندیشہ ہے کہ زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوگا تاہم آخری فتح اسلام اور مسلمانوں کو حاصل ہوگی۔ اس وقت اسرائیل اور فلسطین کا تصادم ایک انتہائی خوفناک صورت اختیار کرنے کو ہے۔

وجہ یہ ہے کہ اسرائیل اور فلسطین کی آبادی اگر چہ تقریباً برابر ہے تاہم اسرائیل کے پیچھے اگر دنیا کے ایک کروڑ یہودی اور پروٹسٹنٹ عیسائی دنیا ہے جن کی قیادت امریکہ اور برطانیہ کے ہاتھ میں ہے تو دوسری طرف فلسطین کی پشت پر پورا عالم عرب اور باقی دنیا کے عجمی مسلمان موجود ہیں۔ ان دونوں کے ٹکرانے سے جو خوفناک منظر سامنے آئے گا اس کی ہولناکی محتاج بیان نہیں۔ اگر مشرق وسطیٰ میں یہ بھٹی دہک گئی تو عرب مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹے گی وہ دراصل دین اسلام سے بے وفائی کی پاداش میں ایک ملعون قوم کے ہاتھوں ان پر گویا اللہ کے عذاب کی شکل ہوگی۔ دوسرے مسلمانوں کے معاملے میں عربوں کا جرم اس اعتبار سے زیادہ بڑا ہے کہ انہوں نے اس فضیلت کے باوجود کہ نبی اکرم ﷺ انہی میں سے تھے اور انہی کی زبان میں اللہ کا کلام نازل ہوا' نوآبادیاتی نظام سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اللہ کی بجائے واشنگٹن کی طرف رخ کر لیا یا ماسکو کو اپنا قبلہ بنا لیا۔

گنبد صخرہ کا مسئلہ لاینحل ہے۔ نہ ہی مسلمان اس سے کبھی دستبردار ہو سکتے ہیں اور نہ یہودی اس کی جگہ تیسرے ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے باز آ سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ بڑی جنگ ہو کر رہے گی جس کی خبریں احادیث میں دی گئی ہیں۔ اس موقع پر حضرت عیسیٰ ؑ اور حضرت مہدی کی مدد کے لئے فوجیں افغانستان اور پاکستان ہی سے روانہ ہوں گی۔ لہٰذا ہم میں سے ہر شخص کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ پاکستان کے اس رول کو مضبوط کرنے کے لئے دین کے تقاضوں کو پورا کرے اور مملکت خداداد پاکستان کو ایک حقیقی اسلامی ریاست بنانے کے لئے بھرپور جدوجہد کرے۔

امیر تنظیم اسلامی کی جانب سے قومی اخبارات کو جاری کردہ

ترتیب وار تین اشتہارات

جن میں موجودہ حالات میں مسلمانانِ پاکستان کی رہنمائی کا وافر سامان موجود ہے!

کون سا اسلامی نظام؟

آج کل جب بھی پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی بات کی جاتی ہے تو بعض حلقوں کی جانب سے فوراً سوال کر دیا جاتا ہے: ''کیا طالبان کا اسلام؟''

اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگرچہ طالبان کی حکومت یقیناً اسلامی تھی' اس لئے کہ اس میں شریعت اسلامی کو مکمل بالادستی حاصل تھی ـــــ مزید برآں طالبان حکام نے دورِ خلافت راشدہ کی سی سادگی کا نمونہ بھی پیش کر دیا تھا' تاہم ابھی وہاں اسلام کا مکمل سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام قائم نہیں ہو سکا تھا اور خاص طور پر عہد حاضر کے تقاضوں کا تو کوئی تصور بھی سامنے نہیں آ سکا تھا ـــــ اگرچہ پوری امید تھی کہ اگر طالبان کو مہلت مل جاتی تو یہ جملہ تقاضے پورے ہو جاتے ـــــ بہر حال ان کا معاملہ کم از کم فی الحال خارج از بحث ہے!

واضح رہے کہ عہد حاضر کی مثالی ترقی یافتہ اسلامی ریاست ـــــ یا بالفاظ دیگر اس عالمی نظامِ خلافت کا نقطہ آغاز بننے کے لئے جس کی پیشین گوئی محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے' اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت نے بطورِ خاص پاکستان کو تیار کیا ہے! ـــــ اس کے شواہد؟ جی ہاں' ملاحظہ فرمایئے:

- ☆ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے شروع ہو کر چار صدیوں تک سلسلہ مجددین ہند میں!
- ☆ بیسویں صدی کی عظیم ترین شخصیتیں (علامہ اقبال' مولانا مودودی' مولانا الیاس وغیرہم) بھی ہند ہی میں! جن کے فکر و عمل کا ڈنکا پوری دنیا میں بج رہا ہے!
- ☆ عظیم تحریک خلافت صرف ہند میں' جس میں ہندوؤں کو بھی شریک ہونا پڑا تھا!
- ☆ آزادی کی جدوجہد میں اسلام کا حوالہ صرف تحریک پاکستان میں یعنی: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!''
- ☆ پاکستان کا معجزانہ قیام! اور ☆ اس کا ''نزول'' شب قدر میں!!
- ☆ ''قراردادِ مقاصد'' کے ذریعے سیکولرزم کے عالمی ابلیسی نظام کو چیلنج
- ☆ ختم نبوت اور ناموس رسالت ﷺ کا آئینی و قانونی تحفظ!! اور
- ☆ نجی اور تجارتی ہر قسم کے سود کی حرمت کے عدالتی فیصلے کے ذریعے یہود کے عالمی مالیاتی امپریلزم کو چیلنج!!

مزید برآں ان شاء اللہ اسرائیل کے زہر کا تریاق بھی پاکستان ہی بنے گا چنانچہ اسی مقصد کے لئے اسے معجزانہ طور پر ایٹمی صلاحیت عطا کی گئی ہے!!

تو کیا اتنا طویل سفر طے کرنے کے بعد اب ملت اسلامیہ پاکستان سیکولرزم کی راہ پر چل پڑے گی؟

نہیں! ان شاء اللہ العزیز' ہرگز نہیں!!

بلکہ ـــ ع ''جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے!'' کہ ـــ پاکستان کی تقدیر اسلامی نظام ہے!!

البتہ یہ سوال واقعی اہم ہے کہ اس نظام کے خد و خال کیا ہوں گے!! تو اس کا جواب کل ملاحظہ فرمائیں ـــــ

خاکسار **اسرار احمد**
امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان

عہد حاضر کی مثالی اسلامی ریاست کے خدو خال!

☆ سیاست اور حکومت کی سطح پر:

اللہ کی حاکمیت کے اقرار کے ساتھ اور کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی کامل بالادستی کے تحت عہد حاضر کی اعلیٰ ترین جمہوری اقدار کا حامل نظام۔ جس میں نئی قانون سازی یعنی ''اجتہاد'' پارلیمنٹ کے ذریعے ہو گا' البتہ اس امر کا فیصلہ کہ کوئی اجتہاد شریعت کی حدود سے تجاوز تو نہیں کر گیا عدالت عظمیٰ کرے گی!

(نوٹ ○ بالغ رائے دہی کا اصول' وحدانی یا وفاقی اور صدارتی یا پارلیمانی نظام' ایک ایوان کی مقننہ یا دو ایوانوں پر مشتمل' اسی طرح مرکز اور صوبوں کے مابین اختیارات کی تقسیم ایسے جملہ معاملات مباحات کے دائرے میں داخل ہیں اور ان کے ضمن میں عوام کثرت رائے سے جو راستہ چاہیں منتخب کر سکتے ہیں ○ سیاسی جماعتوں کی اجازت ہو گی لیکن ان کے منشور میں کوئی غیر اسلامی شے شامل نہیں ہو سکے گی ○ انتخابات میں ووٹ تو متقی اور غیر متقی سب دیں گے البتہ امیدواروں کے اخلاق و کردار کی بھرپور سکریننگ کی جائے گی! ○ عدلیہ پوری طرح آزاد اور بااختیار ہو گی!)

☆ معاشیات کے ضمن میں:

(ا) تجارت اور صنعت کے میدان سے سود اور جوئے کے مکمل خاتمے کے بعد ذاتی ملکیت' شخصی امنگ اور کھلے مقابلے پر مبنی سرمایہ کاری اور مارکیٹ اکانومی کا پورا جدید نظام (ب) جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کے خاتمے کے ذریعے زراعت کے میدان میں عدل و قسط کا قیام!

(نوٹ ○ پاکستان کی اراضی اگر خراجی یعنی اجتماعی ملکیت ہیں تو ایک بالکل نیا بندوبست اراضی کیا جا سکتا ہے جس کے ذریعے کاشتکاروں کو زمین دے کر ان سے خراج وصول کیا جائے گا جس سے کثیر ریونیو حاصل ہو گا اور بعض غیر فطری ٹیکسوں سے نجات مل جائے گی اور اگر عُشری یعنی ملکیتی قرار دی جائیں تو امام ابوحنیفہؒ 'امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متفقہ فتویٰ کے مطابق مزارعت کو حرام قرار دے کر صرف خود کاشت رقبہ رہنے دیا جائے گا)

(ج) زکوٰۃ کے مکمل نظام کے ذریعے غیر مسلموں سمیت ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت! (گویا اعلیٰ ترین سطح کی سوشل سیکورٹی)

☆ معاشرت کے ضمن میں:

عریانی' بے پردگی اور مخلوط معاشرت کے خاتمے کے ساتھ مردوں کی طرح خواتین کی تعلیم و تربیت کا بھی مکمل لیکن جداگانہ بندوبست' اور ان کی افرادی قوت (ورک فورس) کا قومی اقتصادیات کے میدان میں بھرپور استعمال!

(مثلاً ○ گھریلو صنعت کا رواج ○ پرائمری تعلیم کلیتاً خواتین اساتذہ کے حوالے ○ ایسے انڈسٹریل یونٹ جن میں خواتین ہی کام کریں اور خواتین ہی سپروائز کریں اور ان کے اوقات کار نسبتاً کم ہوں ○ ایسی زنانہ مارکیٹیں جن میں خواتین ہی دکاندار ہوں اور صرف خواتین اور بچے ہی خریداری کے لئے اندر جا سکیں! ○ مردانہ ہسپتالوں میں صرف مرد نرسز! ○ اسی طرح ہوائی جہازوں میں صرف مرد میزبان! —— وقس علی ذالک

فرمایئے! رکاوٹ کہاں ہے؟ اور ترقی کی گاڑی کہاں رکتی ہے؟

؎ بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے! ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے! (اقبال)

تاہم ابھی یہ سوال باقی ہے کہ پاکستان کے معروضی حالات میں یہ نظام کیسے قائم کیا جا سکتا ہے —— تو اس کا جواب کل ملاحظہ کریں!

خاکسار **اسرار احمد**
امیر تنظیم اسلامی'
داعی تحریک خلافت پاکستان

پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا لائحہ عمل

پاکستان کے معروضی حالات میں اسلامی نظام کے قیام کا سہل اور جلد کامیابی کی ضمانت والا لائحہ عمل تو یہ ہے کہ:

☆ تمام دینی و مذہبی جماعتیں اقتدار کی کشاکش اور انتخابی سیاست کے لاحاصل کھیل سے کنارہ کشی اختیار کر کے ''وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ'' کے مصداق ایک منظم جمعیت کی شکل اختیار کر لیں جو آیت مبارکہ (آل عمران: ۱۰۴) کے مطابق صرف تین کام کرے (۱) خیر کی جانب دعوت (اور سب سے بڑا خیر قرآن حکیم ہے) (۲) نیکی کا مشورہ اور حکم' اور (۳) برائیوں سے روکنا!

☆ یہ ''برائیوں سے روکنا'' ابتداءً صرف زبان و قلم کے ذریعے اور دلیل اور اپیل کی صورت میں ہوگا لیکن مناسب طاقت فراہم ہونے پر منظم اور پرامن مظاہروں' ہڑتالوں' یہاں تک کہ سول نافرمانی کا راستہ اختیار رجائے گا!

مطالبات میں سرفہرست

یہ دو امور ہونے چاہئیں:

۱) دستور پاکستان کی اسلامی دفعات کو غیر مؤثر بنانے والے چور دروازے بند کرنے کے لئے: (ا) دفعہ ۲۲۷ کو اسلامی نظریاتی کونسل سے علیحدہ کر کے قرارداد مقاصد کے ساتھ دفعہ ۲۔ ب کی حیثیت سے نتھی کر دیا جائے۔ (ب) فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرہ اختیار پر عائد تمام تحدیدات کو فی الفور ختم کر دیا جائے اور اس کے ججوں کا رتبہ اور شرائط ملازمت ہائی کورٹس کے ججوں کے مساوی کیا جائے (ج) اسلامی نظریاتی کونسل کو ختم کر دیا جائے اور اس میں شامل جید علماء کرام کے ذریعے فیڈرل شریعت کورٹ کی توسیع کی جائے —— تاکہ قوانین کو اسلامی بنانے کا عمل پرامن اور ہموار انداز میں مناسب تدریج کے ساتھ جاری ہو جائے!

۲) کم از کم اندرون ملک سود کا خاتمہ فی الفور کر دیا جائے —— اور بینکنگ کے ضمن میں جو سکیمیں اب تک پیش ہوئی ہیں ان میں سے کسی ایک کو فوری طور پر نافذ العمل کر دیا جائے' اس میں بہتری کے لئے اقدامات بعد میں بھی جاری رہ سکتے ہیں!

اس کے بعد رفتہ رفتہ مختلف قسم کے منکرات کے خلاف اقدامات کئے جا سکتے ہیں —— یہاں تک کہ حق پورے کا پورا آ جائے اور باطل سارے کا سارا دفع ہو جائے —— ''جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ!''

لیکن اگر

دینی و مذہبی قیادت اپنی سابقہ روش ہی پر برقرار رہتی ہے اور انتخابی سیاست کے کھلونوں ہی سے دلوں کو بہلاتی رہتی ہے —— تب بھی تنظیم اسلامی اپنی بے بضاعتی کے باوجود (حضرت علیؓ کے اس قول کے مطابق جو انہوں نے بنی ہاشم کی دعوت کے موقع پر کہا تھا کہ: ''اگرچہ میں عمر میں سب سے کم ہوں' اور میری ٹانگیں بھی پتلی ہیں اور میری آنکھیں بھی دکھتی ہیں لیکن میں اللہ کے رسولؐ کا ساتھ دوں گا!) مذکورہ بالا طریق پر عمل پیرا رہے گی! اللہ کے بندوں کو ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ'' کی پکار کے ساتھ' اور اللہ سے اس دعا کے ساتھ کہ استقامت عطا فرمائے اور نصرت سے نوازے' آمین!

خاکسار **اسرار احمد**'
امیر تنظیم اسلامی و
داعی تحریک خلافت پاکستان

برائے رابطہ و مزید وضاحت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور' فون: 03-5869501
67۔ اے علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو' لاہور فون: 6366638

مسئلہ شفاعت

بحوالہ درس آیۃ الکرسی

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ۲۳ مارچ ۱۹۹۷ء کا درسِ قرآن

گزشتہ اتوار کو ہم نے آیۃ الکرسی پر غور شروع کیا تھا اور تمہیدی مضامین بیان ہو گئے تھے۔ اس آیۂ مبارکہ کی عظمت' نبی اکرم ﷺ کی نگاہ میں اس کی قدر و منزلت' اس کا موضوع اور خود اس موضوع کی اہمیت سے متعلق مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ آیۂ مبارکہ قرآن مجید کی عظیم ترین آیت ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اگر ہم اس آیت کا تجزیہ کریں تو اسے دس یا کم از کم نو جملوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے تین جملوں میں نہایت ہی بلند فلسفیانہ مضامین آئے ہیں:

﴿اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ﴾

اس پر ہماری گفتگو تقریباً مکمل ہو چکی ہے اور میں اب اس کا اعادہ نہیں کروں گا۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ﴾ آیۃ الکرسی کا یہ ٹکڑا براہِ راست ''مسئلہ شفاعت'' سے متعلق ہے۔ اور اس کے بارے میں تفصیلی گفتگو آج ہوگی۔ اس ٹکڑے سے پہلے اور اس کے بعد جو ٹکڑے ہیں ان کا تعلق بھی اس مسئلہ شفاعت سے ہے۔ اور ایک اعتبار سے غور کیا جائے تو اگر اس آیۂ مبارکہ کو نو (۹) جملوں پر مشتمل مانا جائے تو پہلے تین اور آخری تین جملوں کے درمیان کے تین جملے مسئلہ شفاعت سے متعلق ہیں:

﴿لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ

الاَّ بِمَا شَآءَ ﴾

تمہیداً میں عرض کر دوں کہ مسئلہ شفاعت ہمارے دین کے بڑے مشکل مسائل میں سے ہے۔ بلکہ آج جب میں غور کر رہا تھا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مشکل ہونے کے اعتبار سے یہ بالکل مسئلہ جبر و قدر کے ہم پلہ ہے' جسے عام طور پر عام فہم الفاظ میں ہم تقدیر کا مسئلہ کہتے ہیں۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں اگر کوئی بحث کی جائے تو معاملہ الجھ جائے گا' سمجھ میں نہیں آئے گا۔ چونکہ اس پر ایمان لانا ہم پر واجب کیا گیا ہے لہٰذا ایمان لانے کے ہم مکلف ہیں۔ احادیث میں جو ایمانیات بیان ہوئی ہیں ان میں ایمان بالقدر بھی شامل ہے۔ حدیث جبرئیل میں یہ الفاظ آئے ہیں: ((اَنْ تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی)) آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایمان کے تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ تم تقدیر پر ایمان رکھو کہ اس کا خیر بھی اور اس کا شر بھی دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ جو ایمانیات کے ضمن میں اتنی اہمیت کا حامل ہے' اس کے بارے میں اگر کھود کرید کی جائے' لمبی گفتگو کی جائے' ردّوقدح ہو' بحث و نزاع ہو تو یہ الجھ جائے گا اور حل نہیں ہوگا۔ اگرچہ انسان اسے سمجھنا چاہے تو سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اور یہ بھی اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ جو چیز سمجھ میں نہ آ سکتی ہو اس پر ایمان لانا اور ہمارا مکلّف ہونا غیر منطقی ہو جائے گا۔ چنانچہ سمجھ میں آنا اور بیان میں آنا ان دونوں چیزوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک چیز سمجھ میں آتی ہے لیکن بیان میں نہیں آتی۔ بیان کرنے میں ہماری قوتِ بیانیہ کی جو محدودیتیں ہیں وہ آڑے آتی ہیں' اس بناء پر وہ مسئلہ الجھ جاتا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں حضور ﷺ نے بہت سختی سے فرمایا ہے کہ کوئی بحث و نزاع نہ کرو۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ باہر تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ کچھ صحابہؓ مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے مسئلہ تقدیر کی بحث میں مصروف ہیں۔ یہ دیکھ کر آنحضور ﷺ کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا اور آپؐ نے غضب ناک انداز میں فرمایا: ((اَلِھٰذَا اُمِرْتُ؟ اَمْ لِھٰذَا بُعِثْتُ؟)) ''کیا مجھے اس چیز کا حکم دیا گیا تھا؟ کیا میں اس کام کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں؟'' یہ معاملات ایسے ہیں کہ ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی جانی چاہئے۔ بہر حال اسی طرح کا مسئلہ شفاعت کا مسئلہ بھی ہے۔

میں نے بارہا عرض کیا ہے کہ زندگی میں ہمارا سابقہ بعض ایسے معاملات سے پیش آتا ہے جن کے لئے ہمارے ہاں روایتی الفاظ آتے ہیں کہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز کہ ذرا اِدھر ہوئے تو ہلاکت ہے اور ذرا اُدھر ہوئے تو ہلاکت ہے۔ اس طرح کا نازک معاملہ اس دنیا میں ''صراطِ مستقیم'' پر چلنے کا بھی ہے اور قیامت میں ''پل صراط'' کا بھی۔ بعض مسائل واقعتاً ایسے ہوتے ہیں کہ ذرا سا بھی انسان اِدھر یا اُدھر ہو جائے تو گمراہی یا ہلاکت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اسی طرح کا معاملہ ''مسئلہ شفاعت'' کا ہے۔

شفاعت کا معنیٰ ومفہوم

پہلے سمجھئے کے شفاعت کا معنیٰ کیا ہے۔ شفاعت کا مادہ ''ش ف ع'' ہے۔ عربی زبان میں ہر شے کے مفہوم کی تعیین اس کے مادے (root) سے ہوتی ہے جو عموماً سہ حرفی ہوتا ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ نے ''مفردات القرآن'' میں ''شفع'' کا معنیٰ لکھا ہے: ''ضمّ شیءٍ علٰی مثلہ'' یعنی کسی شے کو اس کے مثل کے ساتھ جمع کر دینا' ضم کر دینا' اس کے ساتھ شامل کر دینا۔ اب مثلاً میں ایک دعا کر رہا ہوں کہ ''اے اللہ! میری یہ حاجت پوری فرما دے!'' میرا کوئی اور دوست' میرا بھائی یا میرا عزیز کہہ دے کہ ''اے اللہ تُو میرے اس بھائی کی یہ ضرورت پوری فرما دے!'' تو یہ ''شفاعت'' ہے' یہ شفع ہے۔ ایک دعا میں خود کر رہا ہوں' اور میرے کسی بھائی' عزیز' دوست اور خیر خواہ نے اپنی دعا اس کے ساتھ شامل کر دی ہے تو یہ شفاعت ہے۔ اس شفاعت سے تو ہم خوب واقف ہیں اور اس کا کوئی منکر نہیں ہے۔ البتہ ایسی ہستیوں کی شفاعت کا معاملہ ذرا مختلف ہو جائے گا کہ جو ہمارے سامنے مادی طور پر موجود نہیں ہیں' بلکہ غیب میں ہیں' ان کے اور ہمارے مابین غیب کا پردہ حائل ہو چکا ہے۔ مثلاً اولیاء اللہ کی ارواح' انبیاء علیہم السلام کی ارواح اور ملائکہ' یہ تمام غیب میں ہیں۔

دنیا میں جو ہم ایک دوسرے کے لئے سفارش کرتے ہیں اس کے لئے بھی لفظ شفاعت آتا ہے اور یہ قرآن میں بھی مستعمل ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ کا کوئی دوست یا

بھائی ہے جس کا کوئی مسئلہ کسی شخص سے وابستہ ہے' اس کی کوئی ضرورت ہے جسے وہ شخص پورا کرسکتا ہے' آپ اپنے اس بھائی کے ساتھ اس شخص کے پاس جاتے ہیں اور اسے اطمینان دلاتے ہیں کہ یہ قابل اعتماد شخص ہے' جو بات کہہ رہا ہے اس پر آپ اعتبار کر سکتے ہیں' تو یہ چیز بھی شفاعت ہوگئی۔ گویا آپ نے اپنے علم کی بناء پر یا اس حیثیت و وجاہت کی بناء پر جو آپ کو کسی کے نزدیک حاصل ہے' کسی کی سفارش کردی تو دنیا میں یہ شفاعت ہے۔ کوئی شخص ہے جو آپ کی قدر کرتا ہے' آپ کی عزت کرتا ہے' اس کی نگاہوں میں آپ معتمد علیہ انسان ہیں' جو بات کہہ رہے ہیں اس کے اوپر وہ اعتبار کرسکتا ہے' یا یہ کہ کوئی شخص آپ سے محبت کرتا ہے اور اس کی بناء پر وہ آپ کی بات جو جائز حد تک ہو اسے ٹال نہیں سکتا تو آپ اپنی صلاحیتوں یا تعلقات کو کسی کے حق میں استعمال کریں تو یہ ایک شفاعت ہے۔ یہی لفظ اردو میں سفارش کے ہم معنی ہے۔

شفاعت کے ضمن میں قرآن مجید میں ہمیں ایک اصول بتایا گیا ہے:

﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ﴾ (النساء: ۸۵)

''جو شخص اچھی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصّہ پائے گا اور جو بری سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصّہ پائے گا''۔

بالکل منطقی بات ہے۔ اچھی سفارش یہ ہے کہ اس کے اندر حدِاعتدال سے تجاوز نہ ہو' کہیں زیادتی نہ ہو' کسی اور کی حق تلفی نہ ہو' ایک شخص کے لئے کوئی خیر ہو جائے بغیر اس کے کہ کسی اور کی حق تلفی ہو رہی ہو۔ یہ تمام پہلو ایسے ہیں کہ جن کو ہم کہیں گے کہ یہ شفاعتِ حَسنہ ہے۔ اس طرح آپ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ اگر آپ دنیا میں اس طرح کی سفارش کرتے ہیں جس میں جھوٹ نہیں ہے' جس میں کسی کی حق تلفی نہیں ہے' کسی پر ظلم نہیں ہو رہا اور وہاں پر آپ کی سفارش سے کسی شخص کا جائز طریقہ پر کام ہو سکتا ہے تو یہ شفاعت حسنہ ہے اور قرآن حکیم میں اس کی ایک طرح سے تائید کی جا رہی ہے' ترغیب دلائی جا رہی ہے۔ ﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا﴾ ''جس نے کوئی اچھی سفارش کی تو اسے خود بھی اس میں سے حصّہ مل جائے گا''۔ یعنی

اس کو بدلے میں بھلائی ملے گی' اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل کو پسند فرمائے گا اور اس کے اس عمل کا اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

اس کے برعکس اگر شفاعتِ حسنہ کی وہ تمام شرائط تو پوری نہیں ہو رہی ہیں' بلکہ آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں' آپ ایک غلط انسان کی تائید کر رہے ہیں' آپ حقائق کو چھپا رہے ہیں' توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں' یا یہ کہ آپ کسی ایسی بات کے لئے کہہ رہے ہیں کہ جس کا اس کو حق حاصل نہیں ہے' جس سے کہ دوسرے کی حق تلفی ہو رہی ہے' تو اس کے بارے میں فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ﴾ ''اور جو کوئی بری سفارش کرے گا تو اس میں سے اس کو بھی حصہ مل جائے گا''۔ اگر اس کی وجہ سے کسی دوسرے پر ظلم ہوا ہے تو اللہ کے ہاں اس ظلم کی جو پاداش ہو گی اس میں اس شخص کا حصہ بھی ہو گا کہ جس نے اس کے لئے سفارش کی تھی۔

شفاعتِ باطلہ کا تصور

شفاعت کے مذکورہ بالا دو معنی عام ہیں' واضح ہیں' منطقی ہیں' جن میں کوئی اشکال نہیں ہے' کوئی دقت نہیں ہے۔ لیکن شفاعت کا ایک تصور وہ ہے جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ یہ شفاعتِ باطلہ یعنی شفاعت کا غلط تصور ہے جو شرک کی اصل بنیاد ہے۔ دیکھئے دنیا میں ایک تو معاملہ ہے الحاد کا' یعنی خدا کا انکار' میں اس وقت اس سے متعلق گفتگو نہیں کر رہا۔ جبکہ ایک ہے شرک' اور شرک لازماً دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ یعنی کسی بڑے خدا کو مان کر اس کے ساتھ ساتھ چھوٹے خداؤں کو ماننا۔ شرک میں بڑے خدا کا انکار نہیں ہے۔ مشرق سے مغرب تک چلے جایئے آپ کو ہر جگہ شرک کا یہی تصور ملے گا۔ ہندوؤں کے ہاں بھی ''مہادیو'' تو ایک ہی ہے' مگر دیویاں اور دیوتا بے شمار ہیں۔ کوئی اگنی دیوی (آگ کی دیوی) ہے' کوئی جل دیوتا (پانی کا دیوتا) ہے اور کوئی لکشمی دیوی (دولت کی دیوی) ہے۔ گنتے جایئے تو ان کا شمار ختم نہ ہو سکے گا۔ مغرب میں چلے جایئے تو بڑے ''G'' سے لکھا جانے والا ''God'' تو ایک ہی ہے لیکن gods & godesses اتنے ہیں کہ شمار نہیں ہو سکتے۔ بڑے خدا (God) کی تین صفات ہمیشہ مانی گئی ہیں:

the Omnipresent,the Omniscient,the Omnipotent

— وہ Omnipotent ہے یعنی عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے Omniscient ہے یعنی بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہے اور Omnipresent ہے یعنی ہر جگہ موجود ہے۔ بالفاظِ قرآنی ﴿هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ''تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے''۔ یہ تین صفات ہر جگہ مانی جاتی ہیں۔ اس بڑے خدا کا عرب میں بھی یہی معاملہ تھا کہ مشرکین عرب کے نزدیک ''اللہ'' ایک ہی تھا' لیکن ''آلِهة'' بے شمار تھے۔ یہ ''آلهة'' دو طرح سے بنائے گئے۔ ظاہر بات ہے کہ اصل میں تو یہ بگڑے ہوئے نظریات اور تصورات ہیں۔ اصل حقیقت کے اندر تھوڑا تھوڑا ردّ و بدل ہوتے ہوتے وہ شے بالکل ایک نئی بن کر ایک عجیب صورت اختیار کر لیتی ہے۔ شرک کی مختلف صورتیں بھی اسی طرح وجود میں آئیں۔ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ بنی نوعِ انسان اور تاریخِ انسانی کا آغاز وحی کی روشنی میں ہوا ہے' اندھیرے میں نہیں ہوا' ظلمت میں نہیں ہوا' تاریکی مین نہیں ہوا' جہالت میں نہیں ہوا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کے پاس سائنٹیفک اعتبار سے علم بہت کم ہوگا' یا بالکل نہیں ہوگا' لیکن انہیں جو علم عطا ہوا وہ اصل علم تھا' یعنی توحید کا علم: ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (محمد: ۱۹) ''جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں''۔ یہ ہے اصل علم' سو علموں کا ایک علم' بلکہ ہزار علموں کا ایک علم۔ اس اعتبار سے کسی نے بہت صحیح کہا ہے کہ ''علموں بس کریں او یار' اِکّو الف تیرے درکار۔'' یہ ایک الف کافی ہے۔

یہ علم تو ہمیشہ سے تھا' لیکن اس کی بگڑی ہوئی شکلیں وقتاً فوقتاً ظہور میں آتی رہی ہیں۔ دیوی دیوتاؤں کا تصور ایمان بالملائکہ جو ہمارے ایمان کے اجزاء لاینفک میں سے ہے' اس کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ چنانچہ مشرکین کے نزدیک کوئی پہاڑوں کا دیوتا ہے' کوئی بادلوں کا دیوتا ہے' کوئی دریاؤں کا دیوتا ہے۔ درحقیقت یہ وسیع و عریض کائنات جس کی وسعت کے بارے میں ابھی ہمیں کچھ پتہ نہیں ہے' آج بھی اس کے حجم کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا' انسان کو قطعاً پتہ نہیں کہ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور

کہاں ختم ہوتی ہے' اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ایک باضابطہ حکومت اور ایک بیورو کریسی موجود ہے۔ اس کی سول سروس ہے' اس کے کارندے ہیں' اور وہ ملائکہ ہیں جو اللہ کے احکام کی تنفیذ کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن سے جو حقیقت واضح رہنی چاہئے وہ یہ کہ انہیں کوئی اختیار حاصل نہیں ﴿یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ﴾ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں' انہیں کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اگر یہاں ذرا سا بھی پاؤں پھسلا اور ان کے لئے بھی اختیار کا تصور آ گیا تو اب وہ اللہ کے نائبین بن گئے اور نائب کو کچھ نہ کچھ اختیار دیا جاتا ہے۔ اور جب اختیار دیا جاتا ہے تو اس اختیار کے اعتبار سے اس کے ہاتھ میں آپ کا کچھ نہ کچھ خیر و شر تو آ گیا نا! اب اس خیر و شر کے لئے کچھ ڈنڈوت ان کی بھی کی جائے' کچھ اظہارِ تعظیم ان کے سامنے بھی ہو' کوئی اظہارِ نیازمندی کیا جائے۔ چنانچہ یہ ایمان بالملائکہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس نے درحقیقت ان دیوتاؤں اور دیویوں کی صورت اختیار کر لی۔ اس کی نفی سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں جو کہ سورۃ الاخلاص کے تقریباً ہم وزن ہے' بڑے واضح انداز میں کی گئی ہے: ﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ ......﴾ ''اور کہو: کل شکر اور تعریف اللہ ہی کے لئے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا اور نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے''۔

حکومت اور اختیار میں اللہ کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔ یہ پوری بادشاہت تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ روزِ محشر پکار کر پوچھا جائے گا: ﴿لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ﴾ ''آج بادشاہی کس کی ہے!'' سارا عالم پکار اٹھے گا: ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (المؤمن: ۱۶) ''اللہ واحد قہار کی''۔ یہ حقیقت جو قیامت میں بالکل واضح ہو جائے گی آج ذرا چھپی ہوئی اور نگاہوں سے اوجھل ہے۔ آج اسے سمجھنے کے لئے اور اس پر اپنے دل کو قائم رکھنے کے لئے کچھ محنت کی ضرورت ہے۔ قیامت کے دن یہ عریاں حقیقت سامنے آ جائے گی کہ یہ بادشاہی صرف اُس اللہ کے لئے ہے جو اکیلا ہے' تنہا ہے' قہار ہے' چھایا ہوا ہے۔ اس کے قبضۂ قدرت سے کوئی شے باہر نہیں۔

شرک کا دوسرا تصور اس اعتبار سے پیدا ہوا کہ انسان نے اللہ کو بھی کچھ نہ کچھ اپنے اوپر قیاس کیا۔ اور یہ انسان کی مجبوری ہے۔ آخر اس کی اپنی سوچ ہے' اس کی قوّتِ متخیلہ ہے۔ چاہے ہم کہیں کہ قوّتِ متخیلہ کے لئے تو کوئی انتہا نہیں' کوئی limit نہیں' تخیل کو آدمی جہاں تک چاہے لے جائے ۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا!

لیکن سمجھ لیجئے کہ ہماری قوّتِ متخیلہ بھی محدود ہے' اس لئے کہ ہمارا سارا تخیل ہمارے مشاہدات ہی سے بنتا ہے اور ہماری سوچ کے لئے حدود معین ہوتی ہیں۔ تو انسان نے جب خدا کے بارے میں غور کیا تو کچھ اپنے اوپر قیاس کیا' جس کو اقبال نے ایک مکالمے کی صورت میں بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ یہ مکالمہ ایک بُت اور بُت تراش کا ہے' جس نے ایک بُت تراشا تو اس بُت کے دو ہاتھ بنا دیئے' دو آنکھیں بنا دیں' دو پاؤں بنا دیئے۔ اپنی طرف سے تو وہ خدا بنا رہا ہے' دیوتا بنا رہا ہے' لیکن کیا بنائے گا؟ اپنے دو ہاتھ دیکھے تو اس کے بھی دو ہاتھ بنا دیئے' اپنی دو آنکھیں تھیں تو اس کی بھی دو آنکھیں بنا دیں' ذرا موٹی موٹی اور بڑی بنا دی ہوں گی۔ ہاتھی دیکھا تو اپنا جو دیوتا بنایا اس کی ناک ہاتھی کی سونڈ کی طرح بڑی سی بنا دی۔ ان کا ایک خدا ہے گریشتی جس کی ناک ہاتھی کی سونڈ کی مانند ہے۔ لیکن آدمی جائے گا کہاں؟ وہ اپنی کھال سے باہر تو نہیں نکل سکتا۔ انسان اپنے تخیلات اور تصورات میں بھی اپنے مشاہدات سے باہر کہاں جائے گا؟ چنانچہ اقبال نے جو مکالمہ بیان کیا ہے اس میں بُت اپنے بُت تراش سے کہہ رہا ہے کہ تو نے مجھے خدا بنانا چاہا تھا' لیکن تو نے بنایا کیا ہے؟

مرا بر صورتِ خویش آفریدی
بروںِ خویشتن آخر چہ دیدی!

''تُو نے مجھے اپنی شکل میں ڈھال دیا۔ جو اپنے آپ کے اندر دیکھا وہ میرے اندر بنا دیا۔ تُو نے اپنے آپ سے باہر کیا دیکھا؟ کچھ بھی نہیں دیکھا!''

اسی طرح انسان نے خدا کو بھی تصور کیا کہ جیسے ایک انسان کو اولاد سے محبت ہوتی

ہے۔ بیٹا کسی اور اعتبار سے محبوب ہوتا ہے اور بیٹی کی محبوبیت کسی اور اعتبار سے ہوتی ہے۔ بیٹی کمزور ہے' جنسِ ضعیف ہے' لیکن اس پر واقعتاً شفقت زیادہ ہوتی ہے۔ بیٹا اس لئے پیارا ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے میرا نام چلے گا' یہ بڑھاپے میں میرا سہارا بنے گا' اور اس سے خاندان کا سلسلہ آگے چلے گا۔ اس اعتبار سے اگرچہ بیٹے کی بہت اہمیت ہے' مگر بیٹی کے ساتھ محبت جذباتی لگاؤ سے ہوتی ہے۔ بیٹی کوئی بات کہہ دے تو ٹالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے حقیقت یہ ہے کہ میں بسا اوقات بمشکل اپنے آنسوؤں کو روکتا ہوں جب یہ واقعہ بیان کرتا ہوں کہ حضور ﷺ کے سامنے جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں' جن کے بارے میں حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ((فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِنِّی)) یعنی ''فاطمہؓ میرے جگر کا ٹکڑا ہے''۔ تصور کیجئے کہ وہ آپؐ کے پاس آ کر خود اپنے ہاتھوں پر پڑے گٹے دکھا رہی ہیں کہ ابا جان! دیکھئے' یہ چکی چلا چلا کر میرے ہاتھوں پر گٹے پڑ گئے ہیں' کندھے کا نشان دیکھئے کہ مشکیزے میں خود کنویں سے پانی بھر کر لاتی ہوں' اس کی وجہ سے میرے کندھے پر نشان پڑ گئے ہیں' اب تو عام مسلمانوں کے ہاں بھی بڑی سہولت ہوگئی ہے' فراوانی ہے' وہ تنگدستی اور عسرت کا دَور ختم ہوگیا ہے' تو ابا جان مجھے بھی کوئی کنیز' کوئی غلام عطا فرما دیجئے کہ میری بھی مشکل آسان ہو جائے۔ اندازہ کیجئے کہ آنحضور ﷺ کے دل پر اس وقت کیا بیتی ہوگی۔ مگر آپؐ نے فرمایا: ''نہیں بیٹی' یہ چیزیں ہمارے لئے نہیں ہیں' میں تمہیں اس سے بہتر چیز دے رہا ہوں (یہ وہی عمل ہے جو تسبیح فاطمہؓ کے نام سے مشہور ہے۔ جب بھی آپ تسبیح فاطمہؓ کیا کریں تو یہ واقعہ بھی یاد کر لیا کریں۔ آپؐ نے فرمایا:) بیٹی! نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ' ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۳ یا ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو''۔ (روایات میں تھوڑا سا فرق ہے' بہرحال سو کی تعداد پوری ہوتی ہے۔) دیکھا آپ نے! بیٹی کا خاص معاملہ ہوتا ہے۔ اسے ذہن میں رکھئے۔ تو عربوں نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے دیا' وہی فرشتے جنہیں مشرق اور مغرب والوں نے نائبینِ سلطنت قرار دیا' انہیں عربوں نے خدا کی بیٹیاں قرار دے دیا کہ اب یہ لاڈلی بیٹیاں سفارش کریں گی تو

اللہ نہیں ٹال سکتا۔

اسی طرح خیال کیا گیا کہ اللہ کے کچھ دوست بھی تو ہیں' اولیاء ہیں۔ دوست سفارش کرے تو دوست کیسے ٹال سکتا ہے۔ یہ سفارش کا دوسرا تصور تھا جو اس مذہب کے پورے ڈھانچے اور پورے سانچے کے اندر داخل ہوا۔ جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں' شرک کی یہ شاخیں توحید کے تصور کو مسخ کر کے اس سے نکالی گئیں۔ مشرکین عرب کا تلبیہ یہ ہوتا تھا: **لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ' لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ' اِلَّا شَرِیْکًا تَمْلِکُهٗ وَمَا مَلَکَ** ''حاضر ہوں! اے اللہ میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں! تیرا کوئی شریک نہیں۔ اے اللہ میں حاضر ہوں! تیرا کوئی شریک نہیں' سوائے اس شریک کے جس کا تُو ہی مالک ہے اور اس کے ہاتھ میں جو اختیار ہے وہ بھی درحقیقت تیرا ہی دیا ہوا ہے''۔ اس طرح توحید کے دریا سے شرک کی کھاڑی نکالی گئی اور پھر اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لئے اسے توحید میں شامل کر دیا گیا۔ گھوم پھر کر توحید میں واپس آئے کہ ہم نے تیرے جو شریک ٹھہرا لئے ہیں وہ خود بھی تیرے مملوک ہیں' اور جو اختیار ان کے پاس ہے وہ بھی تیرا ہی عطا کردہ ہے' ملکیت تو درحقیقت تیری ہی ہے۔ تو گویا توحید سے شروع ہو کر اپنی دانست میں پھر توحید پر پہنچے۔ البتہ درمیان میں ایک کجی نکال لی اور ایک ٹیڑھ پیدا کر لیا۔ جیسا کہ آیۃ الکرسی کے بعد آتا ہے کہ ﴿لَا اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ۃ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ۃ﴾ ''دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ بے شک ہدایت گمراہی سے جدا ہو چکی ہے''۔ اسی ''غـیّ'' اور کجی نے دنیا میں سارا فساد پیدا کیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ جو ہمارے سفارشی ہیں چونکہ اللہ کے لاڈلے ہیں لہٰذا وہ سفارش کریں گے جو رد نہیں ہو گی۔

اس خیال کی بھرپور تردید سورۃ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں کی گئی ہے: ﴿لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ﴾ ''اس کا کوئی شریک نہیں بادشاہی میں' اس کا کوئی ولی اور دوست کسی کمزوری کی وجہ سے نہیں ہے''۔ یعنی اللہ کے دوست تو ہیں' لیکن اس کی کسی سے دوستی کسی کمزوری کی بناء پر نہیں ہے۔ تم دوستیاں بناتے ہو' دوستیاں پالتے ہو' اس لئے کہ کسی وقت دوست کام آئے گا' میری

کسی مشکل میں میرا ساتھ دے گا۔ اور جب وہ آڑے وقت میں میرے کام آئے گا تو آج میں اس کی بات کیسے ٹال سکتا ہوں! یہ ہے وہ پورے کا پورا فلسفہ جو ہم اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں اور یہ ہمارے معمولات میں شامل ہے۔ کسی وقت دوست ایک بات کہہ رہا ہے۔ آپ یہ بھی سمجھ رہے ہیں کہ بات صحیح نہیں ہے' یہ کام مجھے نہیں کرنا چاہئے' یہ غلط ہے' لیکن اب اس کا دباؤ ہے' اس لئے کہ وہ آپ کا دوست ہے' آپ کا محبوب ہے۔ لہٰذا آپ اس کا کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ذرا تجزیہ کیجئے' دل کے اندر اصل بات یہ ہوتی ہے کہ اگر آج وہ مجھ سے کوئی کام کرا رہا ہے تو کبھی میں بھی اس سے کوئی کام کرا سکوں گا' یا یہ کہ میں نے بھی تو کبھی اس سے کام کرایا تھا' آج مجبوراً میں اس کی بات ماننے پر تیار ہوں۔ یہ سارے تصورات ہیں اسی شفاعت کے۔

اس سلسلہ میں جو شُفَعاء (سفارشی) مانے جاتے ہیں پہلے قدم پر تو ان کے ساتھ اظہارِ نیازمندی اور اظہارِ تعظیم ہوتا ہے جو بڑھتے بڑھتے مراسمِ عبودیت میں ڈھل جاتا ہے۔ اور جس کی تعظیم کرنی ہے تو پہلے تھوڑی سی تعظیم کی' پھر تعظیم میں ذرا جھک گئے' پھر اور جھک گئے' پھر سجدے میں چلے گئے' اور یہی تو مراسمِ عبودیت ہیں۔ اس کی ایک اور شکل بھی ہے جس کی تفصیل سورۃ الانعام میں آئی ہے کہ ہوتے ہوتے یہ ہوتا ہے کہ اللہ کا حق تو صرف علامت کے طور پر رہ جاتا ہے' اصل حقوق ان شریکوں کے مانے جاتے ہیں۔ دیکھئے' جو سب سے اوپر بیٹھا ہوا ہے اصل اختیار تو اسی کا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان کے صدرِ مملکت ہیں' اصل اختیارات تو انہی کے پاس ہیں۔ وزیراعظم ہے تو اس کے پاس اختیارات ہیں۔ لیکن ایک دیہاتی کے نزدیک پٹواری کی اہمیت صدر اور وزیراعظم سے زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کو تو پتا ہے کہ میرا معاملہ تو اسی پٹواری کے ہاتھ میں ہے' اس کا قلم اِدھر سے اُدھر ہو جائے تو میرے لئے مصیبت بھی آ سکتی ہے اور میری مشکل حل بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اسے کیا معلوم کہ ڈی۔سی صاحب کس بلا کا نام ہے۔ عام دیہاتی کیا جانتا ہے کہ ڈی۔سی اور اے۔سی کیا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک تو اصل صاحب اختیار پٹواری ہے جس نے فصل کے بارے میں رپورٹ لکھنی ہے۔ تو پٹواری سے اوپر والوں تک اس سادہ لوح کاشتکار کا ذہن نہیں جائے گا' وہ تو پٹواری کو

خوش کرنے ہی میں عافیت سمجھے گا۔ پس یہی انداز ہے دیوی' دیوتاؤں کی اہمیت کا۔ عرب یوں کیا کرتے تھے کہ فرض کیجئے کوئی فصل ہے' فصل میں سے کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کے لئے معین کر دیا کہ یہ ہم اللہ کے نام پر خیرات کریں گے اور یہ تھوڑا سا حصہ ہمارے معبودوں کے لئے ہے' کیونکہ کچھ نہ کچھ ان کو بھی تو دینا ہے۔ جانوروں کا اتنا بڑا ریوڑ ہے' اس میں سے اتنے جانور تو ہم نے اللہ کے نام پر چھوڑ دیئے اور تھوڑے بہت فلاں اور فلاں معبود کے لئے ہیں۔ اب فرض کیجئے قحط آ گیا تو اللہ کے حصے میں تو ہاتھ ڈال دیں گے لیکن چھوٹے معبود کے حصے کو نہیں چھیڑ سکتے' کیونکہ وہ تو نزدیک ہی بیٹھے ہیں۔ جیسے کہ پنجابی میں کہتے ہیں کہ ''ربّ نیڑے کہ گھسن؟'' گویا مُکّہ قریب ہے' اللہ دُور ہے۔ بلکہ یہاں تک کرتے تھے کہ جو اللہ کا حق ہے وہ تو ان شریکوں کے حق میں شامل ہو جائے گا لیکن جو اُن کا حق ہے وہ اللہ کے حق میں شامل نہیں ہو سکتا۔ یہ اس بیماری کی تیسری سٹیج ہے۔ اس کا تذکرہ سورۃ الانعام کے اندر موجود ہے۔ چنانچہ سفارش و شفاعت کے اس تصور نے عقائد و مذاہب کی دنیا میں تدریجاً توحید کی جڑ کاٹ دی اور کفر و شرک کی شکل اختیار کر لی۔ شفاعت کے اس تصور کی نفی قرآن مجید میں شدت کے ساتھ دوٹوک انداز میں کی گئی ہے۔

کیا نجات کے لئے محض عمل کافی ہے؟

یہاں ایک بات اور قابل غور ہے۔ آپ قرآن مجید کو پڑھئے تو وہاں عمل پر زور ہے۔ سورۃ النجم کی تین آیتیں پڑھئے:

﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝﴾ (آیات ۳۹۔۴۱)

''اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر صرف وہی جس کے لئے اس نے خود محنت کی۔ اور یہ کہ عنقریب اس کی محنت اس کے سامنے رکھ دی جائے گی (اسے دکھا دی جائے گی)' پھر اسے اس کی پوری جزا دی جائے گی''۔

انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ تو ملنا ہی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا

يَّرَهٗ ﴾

''پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا''۔

معلوم ہوا کہ انسان کی کامیابی کا سارا دار و مدار انسان کے عمل' محنت اور مشقت پر ہے۔ یہ تو ہے قرآن مجید کی بنیادی اور محکم تعلیم۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کو قرآن مجید میں یہ بات بھی ملے گی کہ کسی نیکی کی توفیق بھی انسان کو از خود حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ ﴿لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴾ ایک اصول موضوعہ ہے' اور جڑ یہی ہے' بنیاد یہی ہے' لیکن تمہارے اندر نیکی کا ارادہ پیدا ہونا' اس جذبے کا ابھرنا' خیر کا داعیہ بیدار ہونا' اچھے جذبات کا نشو و نما پانا یہ سب کچھ اللہ کی توفیق سے ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴾ (التکویر:۲۹) ''اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ رب العالمین نہ چاہے''۔

دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ملاحظہ کیجئے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَنۡ یُّدۡخِلَ اَحَدًا مِّنۡکُمۡ عَمَلُہُ الۡجَنَّۃَ)) قَالُوۡا : وَلَا اَنۡتَ یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ؟
قَالَ : ((وَلَا اَنَا' اِلَّا اَنۡ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ مِنۡہُ بِفَضۡلٍ وَّرَحۡمَۃٍ)) (مسلم)

''تم میں سے کسی بھی شخص کو محض اس کا عمل جنت میں ہرگز داخل نہ کر سکے گا''۔ صحابہؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپؐ بھی نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں' میں بھی نہیں' مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے!''

یہاں دیکھئے' آنحضور ﷺ نے دوٹوک انداز میں فرمایا ہے کہ کوئی شخص جنت میں محض اپنے عمل سے ہرگز نہیں جا سکے گا۔ اس پر بعض صحابہؓ نے بڑی ہمت اور جرأت سے کام لے کر پوچھا ہو گا کہ حضور ﷺ! کیا آپ بھی نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں میں بھی نہیں! جب تک میرا ربّ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ نہ لے' مجھے اپنی رحمت کے سائے میں نہ لے لے میں بھی جنت میں داخل نہیں ہوں گا۔ اب دو انتہاؤں کو آپ نے دیکھ لیا۔

انہی کے حوالے سے شفاعت کے مسئلے کا حل نکلتا ہے۔

شفاعت کا قرآنی تصوّر

قرآن مجید میں ایک طرف آپ ان آیات کو اپنے ذہن میں رکھئے کہ جن میں شفاعت کی مکمل نفی ہے۔ ان آیات میں دوٹوک انداز اختیار کیا گیا ہے کہ قیامت میں کوئی شفاعت نہیں ہے۔ چنانچہ کفار و مشرکین کی بات تو چھوڑ دیجئے' ان کا تصور شفاعتِ باطلہ کا تھا اور اس کی قرآن حکیم میں مطلقاً نفی کی گئی ہے۔ دیکھئے ایک سابقہ اُمّتِ مُسلمہ بھی تو تھی اور ابھی تک موجود ہے' جیسے کوئی بادشاہ جلاوطن ہو لیکن موجود تو ہے۔ اگر آپ سابقہ اُمت مسلمہ کا تقابل اپنے آپ سے کریں گے تو بعض اعتبارات سے ان کا پلڑا بہت بھاری پائیں گے۔ جیسے غالبؔ نے کہا تھا ؎

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالبؔ
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا!

چنانچہ ایک ہم ہی تو نہیں ہیں اُمّتِ مُسلمہ' اگلے زمانے میں بھی کوئی اُمّتِ مُسلمہ تھی' وہ اُمت آج تک موجود ہے' لیکن اب وہ اُمت مسلمہ نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کی عمر بحیثیت اُمت دو ہزار برس ہوئی' اس لئے کہ بنی اسرائیل کے بعد اُمت محمد ﷺ ساتویں صدی عیسوی سے شروع ہوگئی تھی اور سابقہ اُمت مسلمہ ۱۴۰۰ ق م سے شروع ہوئی تھی۔ اُمت موسیٰؑ یعنی بنی اسرائیل پورے دو ہزار سال بعد اُمتِ مسلمہ کے منصب سے معزول ہوگئی۔ قرآن مجید اپنی عظمت کے اعتبار سے تمام کتب سابقہ پر حاوی ہے' اس کے لئے خود قرآن میں ''مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن تعداد کے اعتبار سے تو ہم چار کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں نا! جن میں سے تین وہ ہیں جو سابقہ اُمت کو دی گئی تھیں' یعنی تورات' زبور اور انجیل۔

نوٹ کیجئے کہ اس سابقہ اُمتِ مسلمہ کے ابتدائی چودہ سو برس اس حال میں گزرے ہیں کہ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا کہ ان کے مابین کوئی نبی موجود نہ ہو۔ انبیائے کرام کی آمد کا یہ سلسلہ مسلسل چلتا رہا ہے۔ ازروئے حدیث نبویؐ: ((كُلَّمَا هَلَكَ

نَبِیٌّ خَلَفَہٗ نَبِیٌّ))''جب بھی کوئی نبی فوت ہوا اس کا خلیفہ کوئی اور نبی ہو گیا''۔اس سلسلہ کے آغاز پر بھی دو نبی تھے اور اختتام پر بھی دو نبی تھے۔آغاز پر حضرت موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) تھے اور اختتام پر دو نبی حضرت عیسیٰ اور یحییٰ (علیہما السلام) تھے۔ اور اس آغاز اور اختتام کے مابین انبیاء علیہم السلام کا وہ سلسلہ تھا جو کہیں نہیں ٹوٹا۔اس اُمت سے قرآن حکیم میں جو براہِ راست خطاب ہوا ہے اس کے ضمن میں سورۃ البقرۃ کے دس رکوع اہم ترین ہیں۔یعنی پانچویں رکوع سے شروع ہو کر چودھویں رکوع کے اختتام تک' بلکہ پندرھویں کے شروع تک۔ان میں سے بھی ایک رکوع دعوت کا ہے اور باقی نو رکوع ملامت کے ہیں کہ تم نے یہ کیا' تم نے وہ کیا' تم اس گمراہی میں مبتلا ہوئے' تم نے دین میں یہ تحریف کی' تم نے یہ تصورات غلط اختیار کئے وغیرہ وغیرہ۔گویا ایک بڑی طویل فردِ قراردادِ جرم اُس پر عائد کی گئی ہے۔اس فردِ جرم کے آغاز میں اور اختتام پر ایک آیت شفاعت کے بارے میں آتی ہے۔یہاں اس آیت پر غور کیجئے:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۝﴾

''اور ڈرو اُس دن سے جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہیں آ سکے گی' نہ کسی کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی' نہ کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ انہیں کسی طرف سے کوئی نصرت اور مدد مل سکے گی''۔

یہ ہے یومِ آخر یعنی قیامت کے دن کا تصور جو قرآن بیان کرتا ہے۔یہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۴۸ ہے' پھر اسی سورۃ میں آگے جا کر آیت ۱۲۳ میں یہی الفاظ قدرے فرق کے ساتھ بیان ہوئے ہیں:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۝﴾

''اور ڈرو اُس دن سے جس دن کوئی شخص کسی شخص کے کام نہ آئے گا کچھ بھی اور نہ ہی اس سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ اس کو کوئی شفاعت کام دے گی اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی''۔

دیکھئے' کہیں کوئی کسر رہ گئی؟ معلوم ہوا انسان کا اپنا عمل ہی فیصلہ کن ہو گا ﴿لَیْـــــسَ

لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿﴾ اور یہ اسی کی شرح ہے جو سورۃ البقرۃ کی متذکرہ بالا آیت میں بیان ہوئی۔

اب آیۃ الکرسی سے پہلی آیت ملاحظہ کیجئے‘ فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالۡکٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴾ (آیت ۲۵٤)

’’اے ایمان کے دعوے دارو! خرچ کرو‘ لگا دو‘ کھپا دو ان سب چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں دی ہیں اس سے پہلے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس دن نہ کوئی لین دین ہوگا‘ نہ ہی کوئی دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ اور کفر کرنے والے ہی ظالم شمار ہوں گے‘‘۔

یہ آپ نے تین مقامات دیکھے جہاں شفاعت کی مکمل نفی ہے‘ البتہ اس کے بعد استثناء بھی آتا ہے۔ یہ قرآن مجید کا دوسرا اصول ہے۔ ایک طرف تو یہ واضح کر دیا گیا کہ تمہیں اپنے ہی عمل سے نجات مل سکتی ہے ﴿لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿﴾ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا کہ اپنے عمل پر کوئی گھمنڈ نہ ہو جائے‘ اپنے عمل پر تکیہ اور بھروسہ نہ کر بیٹھنا‘ بلکہ دو پہلو ہمیشہ ذہن میں رہیں۔ ایک یہ کہ تمہیں کسی نیک عمل کی توفیق ملی ہے تو وہ بھی اللہ ہی کی جانب سے ملی ہے۔ چنانچہ اہلِ جنت جنّت میں داخل ہوتے ہوئے کہیں گے:

﴿ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَمَا کُنَّا لِنَهۡتَدِیَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾

(الاعراف:٤٣)

’’شکر و تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا‘ ہم خود ہدایت نہ پا سکتے تھے اگر اللہ ہماری راہنمائی نہ کرتا‘‘۔

دوسرے یہ کہ محض اپنے عمل پر تکیہ نہ کرنا‘ کیونکہ تم سے لاکھوں کوتاہیاں ہو رہی ہیں جن کا تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے‘ تم ان کو جانتے بھی نہیں ہو۔ نہ معلوم گناہِ کبیرہ کے کتنے انبار ہم جمع کر لیتے ہیں‘ ان کا وزن کتنا ہوگا‘ لہٰذا رحمت خداوندی کے بغیر چھٹکارا نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ بالکل سچ فرمایا الصّادق والمصدوق محمد رسول اللہ ﷺ نے کہ کوئی انسان محض اپنے عمل سے جنت میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ حضور

اکرم ﷺ اپنے بارے میں فرما رہے ہیں کہ میں بھی جنت میں داخل نہیں ہو سکوں گا اِلّا یہ کہ میرا اللہ مجھے اپنے فضل اور اپنی رحمت کے سائے میں ڈھانپ لے۔ اسی طرح شفاعت کا معاملہ ہے کہ ایک طرف اِس کی دوٹوک انداز میں نفی کی جا رہی ہے' جبکہ بعض آیاتؐ میں اس کا اثبات بھی ملتا ہے۔ میں آپ کے سامنے قرآن حکیم کے آٹھ ایسے مقامات رکھ رہا ہوں جہاں شفاعت کی نفی کے بعد "اِلّا" آیا ہے اور استثناء بیان ہوا ہے۔

(۱) آیۃ الکرسی ہی کو لیجئے۔ اس میں فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ﴾ "کون ہے جو اُس کی جناب میں کسی کی سفارش کر سکے' مگر اُس کی اجازت سے!" آغاز کتنا پُرجلال ہے۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ ؟ "کون ہے وہ؟" اس سوال پر بڑے سے بڑا ولی کانپ کر رہ جائے گا' انبیاء کانپیں گے جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا: مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ ؟ کون ہے جو اپنی ذاتی حیثیت سمجھتا ہے؟ کون سمجھتا ہے کہ مجھ پر اس کا کوئی اختیار ہے؟ کون ہے جو سمجھتا ہے کہ وہ کوئی زور میرے خلاف استعمال کر سکتا ہے؟ کون ہے وہ جو شفاعت کر سکے گا اس کے سامنے؟ اِلَّا بِاِذْنِهٖ "ہاں' سوائے اُس کی اجازت کے"۔ معلوم ہوا کہ جو categorical انداز پچھلی آیت میں تھا کہ "وَلَا شَفَاعَةٌ" اس کو یہاں مزید مؤکد کیا گیا ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ﴾

(۲) سورۃ الانبیاء میں فرمایا: ﴿وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی ﴾ (آیت ۲۸) "وہ شفاعت نہیں کر سکیں گے مگر جن کے لئے اللہ راضی ہو"۔

(۳) پھر سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ﴾ (آیت ۳) "کوئی نہیں ہے شفاعت (سفارش) کرنے والا' اِلّا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے"۔

(۴) سورۂ مریم میں ارشاد ہوا: ﴿لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۞﴾ (آیت ۸۷) "اُس وقت لوگ کوئی سفارش لانے پر قادر نہ ہوں گے بجز اُس کے جس نے رحمٰن کے حضور سے پروانہ حاصل کر لیا ہو"۔

(۵) سورۂ طٰہٰ میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا

مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا ﴾ (آیت ۱۰۹) ''اُس روز کوئی شفاعت کارگر نہ ہو گی' اِلّا یہ کہ کسی کو رحمٰن اس کی اجازت دے دے اور اس کی بات سننا پسند کرے''۔

(۶) سورۂ سبا میں فرمایا: ﴿وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ط﴾ (آیت ۲۳) ''اس کی جناب میں کوئی سفارش کام نہیں آ سکے گی' اِلّا یہ کہ جس کے لئے اس نے اجازت دی ہو''۔

(۷) سورۃ الزخرف میں فرمایا: ﴿وَلَا یَمْلِکُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیت ۸۶) ''اس کو چھوڑ کر یہ لوگ جنہیں پکارتے ہیں وہ کسی شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے' اِلّا یہ کہ کوئی علم کی بناء پر حق کی شہادت دے''۔ یعنی کوئی شخص اپنی سفارش کے ذریعے حق کو باطل یا باطل کو حق ثابت نہیں کر سکے گا۔

(۸) اس ضمن میں آخری مقام سورۃ النجم میں ہے۔ اسی سورت میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ﴾ اسی میں شفاعت کے بارے میں یہ الفاظ بھی ہیں: ﴿وَکَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیَرْضٰی ﴾ (آیت ۲۶) ''کتنے ہی فرشتے ہیں آسمانوں کے اندر لیکن ان کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آ سکتی مگر اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ کسی کے لئے اس کی اجازت دے دے اور اس کو پسند کرے''۔

یہاں بات کو دوطرفہ کر دیا' یعنی سفارش کرنے والے کے لئے بھی اذن اور جس کے لئے سفارش کی جاتی ہے اس کے لئے بھی اذن۔

خوارج اور معتزلہ کا موقف

متذکرہ بالا حقائق کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ صورت حال بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ اِدھر ہوتے ہیں تو شرک' اُدھر ہوتے ہیں تو سرے

سے انکار۔ چنانچہ ہمارے ہاں یہ انتہائیں موجود ہیں۔ خوارج نے سرے سے انکار کر دیا کہ کوئی شفاعت نہیں۔ وہ اس معاملے میں انتہائی شدید تھے۔ ان معاملات کے اندر ان کی شدت کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے۔ کافر ہو گیا تو گویا کہ مرتد ہے' اور مرتد ہے تو وہ واجب القتل ہے۔ پھر تو معاملہ

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریّا می رود دیوار کج

کے مصداق ہو جائے گا۔ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو گیا۔ وہ پہلے مسلمان تھا' اس کی جان' مال' آبرو محفوظ تھی' مسلمان معاشرے کے اندر آپ اس پر کوئی دست درازی نہیں کر سکتے تھے' نہ اس کے مال پر' نہ اس کی جان پر' نہ اس کی عزت پر' لیکن جب مرتد ہو گیا تو اس کا خون بھی مباح ہے' اسے قتل کر سکتے ہو' اس کا مال بھی مباح ہے' سارے کا سارا مال تم لے سکتے ہو' اس کی بیوی بھی تم پر حلال ہو گئی' اسے تم کنیز بنا سکتے ہو۔ اور یہ بھی جان لیجئے کہ یہ انتہائی نیک لوگ تھے' بڑے عابد اور زاہد لوگ تھے۔ ظاہر ہے جن کے تقویٰ کا معیار یہ ہو کہ جو گناہ کبیرہ کرے وہ مرتد ہے' واجب القتل ہے' مباح الدّم ہے' اندازہ کیجئے اس یقین اور عقیدے کے لوگ خود کتنے نیک ہوں گے! مگر نیکی اپنی جگہ پر اور اعتدال و توازن اپنی جگہ پر۔ یہاں بات توازن کی ہو رہی ہے۔ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز راستہ کی بات ہے۔ توازن ہی تو اصل شے ہے۔ خوارج سرے سے شفاعت کے منکر ہیں۔ پھر معتزلہ ہیں جو عقلیت پرست (rationalists) ہیں۔ ان کا موقف اکثر و بیشتر وہی ہے جو عقل کا موقف ہے۔ اور عقل کا موقف تو یہی ہوگا کہ جب اللہ نے انسان کو اختیار دیا' اسے دار الامتحان (دنیا) میں بھیجا تو اب وہ اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ہدایت کا راستہ اختیار کرتا ہے یا گمراہی کے راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ ''چاہو تو شکر کا راستہ اختیار کرو چاہو تو کفرانِ نعمت کا راستہ اختیار کرو''۔ اور ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ ''پس جو چاہے وہ ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر

کرے''۔ ایک شخص کا ارادہ ہو کہ وہ رات کو تہجد پڑھے گا اور دوسرے کا ارادہ ہو کہ وہ رات کو کہیں نقب لگائے گا تو دونوں کو اپنے اپنے ارادے اور عمل کے مطابق جزا اور سزا ملنی چاہئے۔ اب اگر اس نقب لگانے والے کی کوئی سفارش کرے اور چھڑا لے تو یہ بات عقل کے خلاف ہو جائے گی اور عقل پر مبنی پورا فلسفہ دھڑام سے زمین پر آ گرے گا۔ جیسے جبر و قدر کا مسئلہ ہے' اگر انسان مجبور محض ہے تو پھر حساب و کتاب کا ہے کا؟ پھر جزاء و سزا کے کیا معنیٰ؟ انسان کو اللہ نے ایک صلاحیت دی ہے' ایک مہلتِ عمر دی ہے' یہ مہلت امتحان ہے اور یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اس کو اللہ نے صلاحیتیں دی ہیں اور اختیار بھی دیا ہے کہ خواہ اِدھر جاؤ یا اُدھر جاؤ۔ اب نتیجہ نکلنا چاہئے اس کے اپنے اختیار پر' اپنے انتخاب (choice) پر' اپنے عمل پر' اپنی محنت پر۔ یہ عقل ہے۔ اور معتزلہ اس اُمت میں سب سے پہلے عقلیت پسند (Rationalists) یعنی عقل کو برتر تسلیم کرنے والے اور نقل کو اس کے تابع کر دینے والے ہیں۔

ہمارے ہاں عقل اور نقل کی ایک بڑی طویل کشمکش عرصے سے چلی آ رہی ہے۔ واضح رہے کہ نقل سے مراد وہ نقل نہیں ہے جو امتحان میں ماری جاتی ہے' بلکہ نقل سے مراد وہ علوم ہیں جو منقول ہوتے ہیں۔ ان میں سرفہرست قرآن ہے' جو منقول ہے' نقل ہوا ہے' منتقل ہوا ہے' اللہ سے محمد رسول اللہ ﷺ کو فرشتہ کے ذریعے۔ یہ نقل ہے' یہ محمد ﷺ کی عقل کی پیداوار نہیں (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ!) پھر یہ حضور اکرم ﷺ سے منقول ہوا تو صحابہ کرامؓ کو پہنچ گیا' صحابہ کرامؓ سے منقول ہوا تو تابعین کو پہنچ گیا۔ اس طرح یہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہا ہے۔ لفظ ''منتقل'' بھی ''نقل'' ہی سے بنا ہے۔ اسی طرح حدیث بھی نقل ہے۔ حدیث حضور اکرم ﷺ کی وہ بات ہے جو صحابہؓ نے دیکھی یا سنی اور اس کو تابعین تک منتقل کر دیا اور تابعین نے اسے تبع تابعین تک منتقل کر دیا۔ تو ایک ہے نقل اور ایک ہے عقل' یعنی آپ کی logic ہے' آپ کا intellect ہے' آپ کی سوچ و بچار ہے۔ اس کے کچھ اصول ہیں۔ ان اصولوں پر آپ پرکھتے ہیں تو تمام مذاہب کی تاریخ میں عقل و نقل کی یہ کشمکش اور کشاکش موجود

ہے۔ تمام مذاہب کا علم الکلام نقل و عقل کی اسی کشمکش کے نتیجہ میں پیدا ہوا' چاہے وہ عیسائیوں کا علم الکلام ہو' یا یہودیوں کا علم الکلام ہو' یا مسلمانوں کا علم الکلام ہو۔ علم الکلام نام ہی اس کا ہے کہ عقل و نقل میں ربط پیدا کیا جائے' ان کے درمیان کوئی ایسی شکل پیدا ہو جائے کہ تضادات رفع ہو جائیں۔ چنانچہ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ عقل کو نقل کے تابع کر دیتے ہیں اور کچھ لوگ عقل کو اوپر کر کے نقل کو اس کے تابع کر دیتے ہیں۔ تو معتزلہ وہ ہیں جنہوں نے نقل کو عقل کے تابع کیا۔ چنانچہ وہ اکثر و بیشتر قسم کی شفاعتوں کے منکر ہیں۔ وہ کون سی شفاعتیں ہیں' ان کا تذکرہ آگے آئے گا۔ اس معاملہ میں اہل سنت درمیان میں ہیں۔ اہل سنت کا اجماع ہے کہ شفاعت حق ہے۔ اس کی تائید میں قرآن مجید میں آٹھ جگہ پر اِلّا کا لفظ آیا ہے اور یہ مقامات ہم دیکھ چکے ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں شفاعت کی نفی موجود ہے کہ کوئی شفاعت نہیں وہاں استثناءات بھی موجود ہیں۔ اس کی شرطیں تو ہیں لیکن شفاعت کی کامل نفی نہیں ہے۔

شفاعتِ کبریٰ' حدیث کی روشنی میں

احادیث میں شفاعت کی تفاصیل بہت نمایاں طور پر آئی ہیں۔ ایک شفاعت وہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔ دراصل ہمارے ہاں عوام الناس عام طور پر بے سمجھ ہیں اور ہماری عظیم اکثریت جہلاء پر مشتمل ہے' چاہے وہ پی ایچ ڈی ہوں' اس لئے کہ وہ عربی نہیں جانتے اور قرآن و سنت تک اور حدیث تک ان کی براہِ راست رسائی نہیں ہے' لہٰذا درحقیقت وہ جاہل ہیں۔ دنیا کے عالم بے شک ہوں' لیکن دین کے معاملے میں جاہل ہیں۔ ان جہلاء میں سب سے زیادہ گمراہ کن تصور جو پیدا ہوا ہے وہ حضور اکرم ﷺ کی شفاعتِ کبریٰ اور شفاعتِ عظمیٰ کے بارے میں ہے۔ وہ تصور یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ تو اپنی پوری اُمت کی شفاعت کر کے اسے اللہ کے ہاں عذاب کی پکڑ سے اور حساب سے بچا لیں گے۔ چنانچہ جب شفاعتِ کبریٰ یا شفاعتِ عظمیٰ کا ذکر ہوتا ہے تو ہر مسلمان سے ہر قسم کی پکڑ کا اندیشہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ احادیث کا

مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ شفاعت دراصل کیا ہے۔ اس شفاعت کبریٰ کا جو اصل محل ہے وہ دو چیزیں ہیں جو احادیثِ نبویہؐ سے ثابت ہیں۔ قیامت کے دن کا تصور کیجیے جو بڑا سخت ہو گا' بڑا بھاری ہو گا۔ وہ دن کتنا سخت اور بھاری ہو گا اس کا اندازہ سورۃ المزمل میں واردِ ان الفاظ سے کیجیے: ﴿یَوۡمًا یَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِیۡبًا ﴾ ''اس دن کی سختیاں اور صعوبتیں بچوں کو بوڑھا کر دیں گی''۔ ﴿السَّمَآءُ مُنۡفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ کَانَ وَعۡدُهٗ مَفۡعُوۡلًا ﴾ ''آسمان اس کی سختی سے پھٹا جا رہا ہے۔ اس کا وعدہ تو پورا ہو کر رہے گا''۔ آسمان اس دن کے بوجھ سے گویا پھٹا پڑ رہا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو کسی جگہ پر موجود ہو اور اس کے بوجھ سے وہ شے پھٹی جا رہی ہو۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿ثَقُلَتۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ﴾ (الاعراف: ۱۸۷) ''وہ بھاری بات ہے آسمانوں اور زمین میں''۔ یعنی قیامت تو آسمانوں اور زمین کے اندر موجود ہے اور اس کی وجہ سے وہ پھٹ پڑنے کو ہیں۔ وہ دن کیسا ہو گا؟ سورۃ المدثر میں دیکھیے: ﴿فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوۡرِ ﴿ فَذٰلِکَ یَوۡمَئِذٍ یَّوۡمٌ عَسِیۡرٌ ﴿ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ غَیۡرُ یَسِیۡرٍ ﴾ ''جب پھونکا جائے گا صور میں۔ پس وہ دن بہت بھاری دن ہے۔ کافروں پر وہ آسان نہ ہو گا''۔ گویا وہ دن بڑا سخت اور بھاری دن ہو گا اور روایات میں اس کی جو تفاصیل آتی ہیں وہ آپ نے سنی ہوں گی کہ سورج سوا نیزے پر ہو گا' سخت گرمی ہو گی اور لوگ سخت ابتلاء میں ہوں گے۔ یہ دن پچاس ہزار سال کے بقدر طویل ہو گا۔

قیامت کا یہ دن یوم الدین ہے' جزا و سزا کے فیصلے کا دن ہے' judgement کا دن ہے۔ عدالت لگی ہوئی ہے' لوگ فوج در فوج کھڑے ہوئے ہیں' لیکن عدالتی کارروائی کے آغاز میں تاخیر ہو رہی ہے' سماعت (hearing) کا آغاز نہیں ہو رہا۔ اس سختی میں لوگ بھاگیں گے' دوڑیں گے کہ معاملہ جلدی شروع ہو جائے۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیث کے مطابق وہ آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے کہ آپ ابوالبشر ہیں' آپ تمام انسانوں کے باپ ہیں' آپ ہمارے لئے سفارش کیجیے۔ وہ انکار کریں گے کہ نہیں' یہ میرا مقام نہیں ہے۔ اسی طرح لوگ ایک ایک کر کے تمام رسولوں کے

پاس جائیں گے، لیکن ہر کوئی نفسی نفسی پکار رہا ہوگا۔ ہر ایک یہی کہے گا کہ مجھے تو اپنی پڑی ہوئی ہے، میں کیا سفارش کروں۔ بالآخر لوگ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں گے کہ آپ خاتم الانبیاء ہیں، آپؐ اللہ کے بہت محبوب ہیں، آپ ہماری سفارش کر دیجیے۔ چنانچہ اس روایت کے جو الفاظ صحیح مسلم میں آئے ہیں وہ اس طرح ہیں:

((……فَيَأْتُونِيْ فَيَقُوْلُوْنَ : يَا مُحَمَّدُ! اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَخَاتَمُ الْاَنْبِيَاءِ وَغَفَرَ اللّٰهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ' اِشْفَعْ لَنَا اِلٰى رَبِّكَ ' اَلَا تَرٰى مَا نَحْنُ فِيْهِ؟ اَلَا تَرٰى مَا قَدْ بَلَغَنَا؟ فَاَنْطَلِقُ ' فَاٰتِيْ تَحْتَ الْعَرْشِ ' فَاَقَعُ سَاجِدًا لِرَبِّيْ ……))

''اس کے بعد لوگ میرے پاس آ کر درخواست کریں گے کہ اے محمد ﷺ! آپ اللہ کے رسول ہیں، آپ خاتم الانبیاء ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کی ہر اگلی پچھلی لغزش معاف فرمادی ہے، اپنے ربّ کے ہاں ہمارے حق میں شفاعت کر دیں۔ کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ ہماری کیا حالت ہوگئی ہے؟ آپ کو اندازہ نہیں کہ ہم کس مصیبت میں مبتلا ہیں؟ (حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں) چنانچہ پھر میں چلوں گا، اور عرشِ خداوندی کے نیچے کھڑا ہو جاؤں گا، اور پھر اپنے ربّ کے حضور سجدے میں گر جاؤں گا……''

یہاں بھی نوٹ کر لیجیے کوئی زور والی بات نہیں ہے، نہ کوئی تحکم ہے، معاملہ وہ نہیں جو آپ کے ہاں مشہور ہے۔

ربّ دے پکڑے چھڑائے محمدؐ
محمدؐ دے پکڑے چھڑا کوئی نہیں سکدا!

جو تصورات لوگوں کے دلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ بالکل اور ہیں۔ حدیث میں جہاں شفاعت کا اثبات ہو رہا ہے، سمجھئے کہ اس کی نوعیت کیا ہے، نقشہ کیا ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

((ثُمَّ يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلَيَّ وَيُلْهِمُنِيْ مِنْ مَحَامِدِهٖ وَحُسْنِ الثَّنَاءِ عَلَيْهِ شَيْئًا لَمْ يَفْتَحْهُ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ))

''پھر اس وقت اللہ تعالیٰ مجھ پر کھولے گا اور مجھ پر الہام کرے گا اپنی حمد و ثنا کے

بعض ایسے امور کہ اس سے پہلے اس نے کسی پر نہیں کھولے''۔

مجھے یاد آ گیا کہ میں نے یہ روایت سب سے پہلے ۱۹۵۰ء میں مولانا داؤد غزنویؒ سے سنی تھی۔ آپ ایک عجیب شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک طرف تو اہل حدیث تھے مگر دوسری طرف صوفی بھی تھے۔ اور یہ دونوں چیزیں بڑی مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔ اہل حدیث عام طور پر تصوف کے دشمن ہوتے ہیں لیکن مولانا کے ہاں میں نے دیکھا کہ یہ دونوں چیزیں جمع تھیں۔ انہوں نے ایک خطبہ جمعہ میں منٹگمری (ساہیوال) میں یہ واقعہ بیان کیا تھا۔ ایک دوسری روایت میں الفاظ آتے ہیں: ((لِوَاءُ الْحَمْدِ بِيَدِیْ)) کہ قیامت کے دن لوائے حمد باری تعالیٰ میرے ہاتھ میں ہوگا اور اس روز میں اللہ کی جو حمد وثناء بیان کروں گا وہ آج نہیں کر سکتا۔

اس بات کی تفصیل میں نے اپنے دروس میں بیان کی ہے کہ انسان اپنی معرفت اور سمجھ کی مناسبت سے ہی حمد بیان کرتا ہے۔ آپ نے کسی شے میں کوئی حسن دیکھا' اس کے کچھ پہلو آپ پر نمایاں ہو گئے' اس کی خوبیاں آپ پر نمایاں ہو گئیں۔ اس کی جس قدر خوبیوں کی آپ کو معرفت حاصل ہوئی اسی قدر آپ کی appreciation ہو گی اور اسی قدر آپ اس کے محاسن بیان کر سکیں گے۔ اس کے بعض پہلو ایسے ہیں جو آپ پر واضح ہی نہیں ہوئے' لہٰذا آپ کے اندر اُن کو appreciate کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تو اس کو آپ کیسے بیان کریں گے؟ تو جہاں بھی آپ اس کی تعریف و تحسین اور مدح کریں گے وہ محدود (limited) ہو گی' کیونکہ ہر شخص اپنی قوتِ ادراک کے مطابق ہی کسی شے کی عظمت کو سمجھ پاتا ہے۔ اس لئے میں تو کہا کرتا ہوں کہ میرے نزدیک دورِ حاضر میں قرآن مجید کی عظمت کا انکشاف علامہ اقبال پر ہوا ہے۔ میں اپنے محدود علم کی حد تک کسی دوسرے انسان میں قرآن مجید کی عظمت کا وہ ادراک اور وہ انکشاف نہیں پایا جو علامہ اقبال میں پایا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بہت بڑا فلسفی appreciate کر سکے گا کہ قرآن کی کسی آیت میں کتنا بڑا فلسفہ بیان ہوا ہے۔ عام آدمی کو کیا معلوم کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے۔ سورۃ الحشر کے آخری رکوع کی آیت ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسٰهُمْ أَنفُسَهُمْ﴾ کا مطلب اقبال ہی نے

تھا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میرا کل فلسفہ خودی اسی ایک آیت سے مستنبط ہے۔ جس شخص کو فلسفۂ وجود کی کبھی ہوا ہی نہیں لگی اسے کیا خبر کہ وجود کا مسئلہ کیا ہے؟ اسے کیا پتہ ہے کہ ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ میں کیا سمندر پنہاں ہے' کتنی عظیم معرفت مضمر ہے۔ تو عظمت قرآن کا انکشاف ہر شخص پر اپنی استعداد' اپنی صلاحیت' اپنی وسعت اور قلب ونظر کے ظرف کے مطابق ہی ہو سکتا ہے کہ وہ کتنا گہرا ہے' کتنا چوڑا ہے' کتنا بڑا ہے اور اس میں کتنی capacity ہے۔

اسی تناظر میں دیکھئے' حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اُس روز میں اللہ کی جو حمد بیان کروں گا وہ آج نہیں کر سکتا۔ یعنی اُس وقت اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کا جو انکشاف مجھ پر ہو گا وہ آج مجھ پر نہیں ہے۔ حالانکہ جتنا آج بھی ہے ہم اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ حضور ﷺ کی اس حیاتِ دُنیوی کے دوران میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کا جو ادراک حضور ﷺ کو تھا وہ بھی ہمارے لئے وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے' ہمارے تصور سے تو وہ بھی بعید ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ خود مجھے بھی آج وہ ادراک اور شعور حاصل نہیں جو اُس روز مجھے عطا کیا جائے گا۔

شفاعتِ کبریٰ کے بارے میں جو حدیث میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اس میں یہ الفاظ آئے ہیں: ((ثُمَّ يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلَيَّ وَيُلْهِمُنِيْ ......)) ''پھر اللہ مجھ پر کھولے گا اور مجھے الہام فرمائے گا......'' غور کیجئے' یہاں الہام کا لفظ بہت اہم ہے' اس پر ابھی بحث آئے گی۔ اس لفظ کے مفہوم سے شفاعت کی حقیقت کی وضاحت پر خوب روشنی پڑتی ہے اور اس گہرے اور مشکل مسئلہ کی گرہ کھلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دن اپنے محامد اور اوصاف کے وہ پہلو حضور ﷺ پر منکشف فرمائے گا جو اُس سے پہلے کسی پر نہیں کھولے' کسی پر ظاہر نہیں کئے۔ اس موقع پر مجھے وہ دعا یاد آ رہی ہے جو میرے کتابچے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کے اختتام پر درج ہے۔ یہ کئی دعائیں ہیں جو تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ کتابوں میں موجود ہیں۔ میں نے معرفت کے اس خزانے کو جمع کر دیا ہے۔ یہ مقامِ عبدیت کا بہت بڑا مظہر ہے۔ اس دعا کے

الفاظ یہ ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ ' وَابْنُ عَبْدِکَ ' وَابْنُ اَمَتِکَ ' فِیْ قَبْضَتِکَ ' نَاصِیَتِیْ بِیَدِکَ ' مَاضٍ فِیَّ حُکْمُکَ ' عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُ کَ ' اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَکَ ' سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ ' اَوْ عَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِکَ ' اَوْ اَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِکَ ' اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِہٖ فِیْ مَکْنُوْنِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ ' اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ ' وَنُوْرَ صَدْرِیْ ' وَجِلَاءَ حُزْنِیْ ' وَذَھَابَ ھَمِّیْ وَغَمِّیْ (آمِیْنَ یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ)

''اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں' تیرے ایک ناچیز غلام اور ادنیٰ کنیز کا بیٹا ہوں' مجھ پر تیرا ہی کامل اختیار ہے اور میری پیشانی تیرے ہی ہاتھ ہے۔ نافذ ہے میرے بارے میں تیرا ہر حکم اور عدل ہے میرے معاملے میں تیرا ہر فیصلہ۔ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں تیرے ہر اُس اسم پاک کے واسطے سے جس سے تُو نے اپنی ذاتِ مقدس کو موسوم فرمایا' یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو تلقین فرمایا' یا اسے اپنی کسی کتاب میں نازل فرمایا' یا اسے اپنے مخصوص خزانۂ غیب ہی میں محفوظ رکھا' کہ تُو بنا دے قرآن مجید کو میرے دل کی بہار اور میرے سینے کا نور اور میرے رنج وحزن کی جلا اور میرے تفکرات اور غموں کے ازالے کا سبب۔ ایسا ہی ہو اے تمام جہانوں کے پروردگار!''

اس دعا کے آغاز میں آنحضور ﷺ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور کس قدر عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش کر رہے ہیں' کس درجہ تواضع اور انکساری کا اظہار کر رہے ہیں' اور پھر اللہ کی حمد وثنا کے لئے کیسے جملے ادا کر رہے ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمتِ جلال اور حاکمیت کے مظہر ہیں! یوں ایک بندہ اپنے آقائے حقیقی کے سامنے عجز ونیاز اور کامل بیچارگی کے ساتھ پیش ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ کس لئے ہے؟ یہ تمہید ہے سوال کرنے کی' کچھ مانگنے کی۔ پھر مانگنے کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ''میں تجھ سے مانگتا ہوں تیرے ہر اُس اسم پاک کے واسطے سے جس سے تُو نے اپنی ذاتِ مقدس کو موسوم فرمایا' یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو تلقین فرمایا' یا اسے اپنی کتاب میں نازل فرمایا یا اسے اپنے کسی خزانۂ غیب میں محفوظ رکھا''۔ گویا دعا اللہ کے ان ناموں کے واسطہ سے ہو

رہی ہے جنہیں قرآن مجید میں اسماءِ حسنیٰ (اچھے نام) کہا گیا ﴿فَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ (تو اچھے نام اللہ ہی کے لئے ہیں‘ پس اس کو ان ہی ناموں سے پکارو۔)

اس اظہارِ بندگی اور عاجزی کے ساتھ شروع کر کے اور ربّ ذوالجلال کی حمد وثناء بیان کر کے اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں کے توسط سے مانگا کیا جا رہا ہے‘ نہ مال نہ اولاد‘ نہ سکھ نہ خوشحالی‘ بلکہ آپ مانگ یہ رہے ہیں کہ ”اس قرآن کو میرے دل کی بہار بنا دے‘ میرے سینے کا نور بنا دے‘ میرے غم و رنج کا مداوا بنا دے‘ میرے ہموم و تفکرات کے ازالے کا سبب بنا دے!“ تو یہ دعا حد درجہ اہم اور پیاری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہت کم نصیبی ہے ان لوگوں کی جنہوں نے میرا کتابچہ ”مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق“ پڑھا مگر یہ دعا یاد نہ کی جو اِس کے آخری صفحات پر درج ہے۔

بہرحال اس دعا کے یہاں ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس دعا سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ نام ایسے ہیں جو اُس نے ابھی تک اپنے پاس چھپا رکھے ہیں‘ یعنی خزانۂ غیب میں ہی ہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس روز وہ خزانۂ غیب بھی مجھ پر کھول دیا جائے گا‘ اللہ تعالیٰ مجھ پر الہام فرما دے گا۔ وہ تمام خزانے جو مجھ سے پہلے کسی پر نہیں کھولے گئے‘ اُس وقت مجھ پر کھول دیئے جائیں گے۔ ثُمَّ يُقَالُ يَا مُحَمَّدُ! پھر جب یہ سب کچھ ہو جائے گا تو کہا جائے گا: یا محمد!...... یہاں ذرا رک کر دیکھئے‘ یہ نہیں کہا کہ اللہ کہے گا‘ بلکہ کہا يُقَالُ یعنی کہا جائے گا۔ یہ حفظ مراتب کا اظہار ہے۔ کیونکہ ع گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی! مراتب کا لحاظ ضروری ہے۔ ابن عربی کا یہ شعر میرے بعض دروس میں آیا ہے۔

اَلرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلْ
وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی

”ربّ ربّ ہی ہے‘ چاہے کتنا ہی نیچے آ جائے‘ اور بندہ بندہ ہی رہے گا خواہ وہ کتنی بلندی پر چلا جائے“۔

حدیث میں آتا ہے کہ ہر رات کی پچھلی گھڑیوں میں جنہیں آپ small hours of

the morning کہتے ہیں' اللہ تعالیٰ سماءِ دنیا یعنی پہلے آسمان پر نزولِ اجلال فرماتا ہے۔ اور محمد رسول اللہ ﷺ شبِ معراج میں ساتویں آسمان تک پہنچ گئے' لیکن محمدؐ ' محمدؐ ہیں' اللہ اللہ ہے۔ اَلـرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَـنَـزَّلَ رب رب ہی ہے چاہے کتنا ہی نیچے آ جائے' کتنا ہی نزول فرمالے۔ وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی اور بندہ' بندہ ہی رہے گا چاہے کتنا ہی ترقی کرے اور اونچے مقام پر پہنچ جائے۔ یہ ہے حفظِ مراتب۔ تو قیامت کے روز کوئی کہنے والا کہے گا' کوئی پکارے گا' جیسے درباروں کے اندر اعلان کرنے والے ہوتے ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اس وقت مجھ سے کہا جائے گا: یَـا مُـحَـمَّـدُ! اِرْفَـعْ رَاْسَکَ' سَـلْ تُـعْـطَـهْ' اِشْـفَـعْ تُشَـفَّـعْ ''اے محمدؐ! اپنا سر اٹھاؤ (حضور ﷺ سجدے میں پڑے ہوئے ہوں گے اور یہ ساری حمد و ثنا سجدے میں کر رہے ہوں گے) اور مانگو' تمہیں عطا کیا جائے گا' اور سفارش کرو' تمہاری سفارش قبول کی جائے گی۔ فَـاَرْفَـعُ رَاْسِیْ فَـاَقُوْلُ'' پس اس کے بعد میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور عرض کروں گا''۔ یہاں تک کا پورا نقشہ میں نے آپ کے سامنے حدیث کے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

اب یہ شفاعتیں دو ہوں گی۔ ایک جسے شفاعت کبریٰ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حساب کتاب میں جو تاخیر ہو رہی تھی ختم ہو جائے گی' حساب کتاب شروع ہو جائے گا اور دوسری شفاعت کیا ہوگی؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں: فَـاَقُوْلُ : یَـا رَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ! ''پھر میں کہوں گا: پروردگار! مجھے اپنی اُمت کی فکر ہے' پروردگار! مجھے اپنی اُمت کی فکر ہے''۔ فَیُقَالُ یَا مُحَمَّدُ! اَدْخِلِ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِکَ مَنْ لَا حِسَابَ عَلَيْهِ مِنَ الْبَابِ الْاَیْمَنِ مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ تو کہا جائے گا: ''اے محمدؐ! اپنی اُمت میں سے ان لوگوں کو جنت کے دائیں دروازے سے جنت میں داخل کر لو جن کے ذمہ کوئی حساب نہیں''۔ یہ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کون ہوں گے جن پر کوئی حساب نہیں۔ بعض احادیث میں ستر ہزار کا عدد آیا ہے کہ میری اُمت میں سے ۷۰ ہزار لوگ ایسے ہوں گے جن پر کوئی حساب نہیں ہوگا۔ صحیح بخاری میں امام بخاری نے کتاب

الرقاق میں باب قائم کیا ہے: یَدْخُلُ الْجَنَّةَ سَبْعُوْنَ اَلْفًا بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ اُمّتِ محمدؐ میں سے جو ۷۰ ہزار لوگ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے وہ کون ہوں گے؟ یہ لوگ وہ ہوں گے جن کے بارے میں آنحضور ﷺ نے فرمایا: ((کَانُوْا لَا یَکْتَوُوْنَ وَلَا یَسْتَرْقُوْنَ وَلَا یَتَطَیَّرُوْنَ وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ)) ''نہ تو وہ داغ لگواتے تھے' نہ کوئی جھاڑ پھونک کرواتے تھے' نہ کوئی فال لیتے تھے' بلکہ اپنے معاملہ کو کلیتًا اللہ کے حوالے کر دیتے تھے''۔ یہ اوصاف ہیں ان لوگوں کے جن پر کوئی حساب نہ ہوگا۔ دوا اور علاج ایک مناسب حد تک کرنا سنّت ہے۔ لیکن دوا کے ذریعے سے علاج کیجئے' جھاڑ پھونک کے ذریعے نہیں۔ البتہ آپ سے آ کر کسی نے کہا کہ مجھے یہ تکلیف ہے' میں اللہ سے دعا کر رہا ہوں آپ بھی اللہ سے دعا کیجئے' اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں۔ یہ شفاعت ہے اور یہ جائز ہے' ہونی چاہئے۔ اسی طرح کسی نے آپ سے کہا مجھے پانی پلا دو' یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس عالمِ مادی میں جو ہمارے مادی قوانین ہیں ان کے تحت کسی سے مدد مانگ لینا قطعاً نہ کفر ہے نہ شرک۔ لیکن کسی روح کو پکارنا' مثلاً کہنا کہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی میری یہ تکلیف رفع کر دے' یہ شرک ہو جائے گا۔ یا کسی فرشتہ کو پکارنا کہ یا جبرئیل میری اِس وقت یہ مدد کر دے' یہ شرک ہو جائے گا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کو پکارنا' حضرت علیؓ کو پکارنا یا علی مدد! یہ کفر و شرک ہو جائے گا۔ توکل کرنے والے وہ لوگ ہیں جو جھاڑ پھونک نہیں کرواتے' کوئی فال وغیرہ نہیں لیتے۔ بدشگونی اور بدفالی وغیرہ ایسی تمام چیزوں سے ماوراء ہو کر وہ لوگ صرف اللہ پر توکل کرتے ہیں کہ جو اللہ چاہے گا وہ ہوگا اور جو اللہ نہیں چاہے گا وہ نہیں ہوگا۔ مَاشَاءَ اللّٰهُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ۔ کسی جادوگر کا جادو مجھ پر اثر نہیں کر سکتا اگر اللہ نہ چاہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ ہی نے اپنے کلام میں معوّذتین نازل کر دی ہیں اور اس کو آپ شفاء کا ذریعہ بنائیں تو اس کا شمار جھاڑ پھونک میں نہیں ہوگا۔ لیکن کسی کے بارے میں یہ تصور کر لینا کہ وہ از خود مجھے کوئی نقصان پہنچانے پر قادر ہے' یہ شرک و کفر ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

۷۰ ہزار کا عدد شفاعتِ کبریٰ والی اس طویل حدیث میں نہیں اور نہ ہی اس میں یہ وضاحت ہے' لیکن بخاری کی دوسری حدیث میں ہے۔ جیسے کہ قرآن مجید میں ہم ایک آیت کو دوسری آیت سے جوڑ کر نتیجہ نکالتے ہیں اسی طرح احادیث کے بیانات کو جوڑ کر صحیح بات تک پہنچتے ہیں۔ چنانچہ احادیث صحیحہ میں صرف یہ دو شفاعتیں مذکور ہیں جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں۔ ایک یہ کہ جب قیامت کے دن حساب کتاب میں دیر ہو رہی ہوگی' سماعت (hearing) شروع نہیں ہو رہی ہوگی اور لوگ سختیوں میں ہوں گے' اُس وقت آپ کی شفاعت سے حساب کتاب شروع ہو جائے گا اور دوسرے جب آپؐ سے کہا جائے گا کہ اپنی اُمت کے اُن لوگوں کو جنت میں داخل کر دیجیے جن پر کوئی حساب کتاب نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ تو کہیں داغ لگواتے تھے' نہ جھاڑ پھونک کرواتے اور نہ کوئی فال لیتے تھے۔ پرانے زمانہ میں داغ لگا دینے اور نشان لگا دینے کا رواج تھا جس میں کچھ معبودوں کا حوالہ بھی ہوتا تھا اور کچھ اس سے قبائل کی شناخت بھی ہوتی تھی' اس سے بھی روکا گیا۔ اور جھاڑ پھونک سے بھی روکا گیا۔ جو چیز محمد ﷺ سے ثابت ہوگئی وہ تو ہم کریں گے لیکن اس سے آگے جو عملیات وغیرہ ہمارے ہاں مشہور ہیں یہ تمام چیزیں اسی کھاتے میں آ جائیں گی۔ وہ متوکل لوگ جن کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ جنت کے اندر بغیر حساب کے جائیں گے یہی ہیں جو صرف اپنے ربّ پر توکل کریں گے۔ ﴿وَاُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ﴾ پر عمل کرتے ہوئے اپنے معاملات اللہ کے حوالے کر دیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام حالات کو جانتا ہے اور دیکھ رہا ہے ؎ سپردم بتو مایۂ خویش را — تو دانی حساب کم و بیش را! تو یہ دو چیزیں ہیں جو حضور ﷺ کے ساتھ خاص ہوئیں۔ ان کے معتزلہ بھی قائل ہیں۔ آپ نے جان لیا کہ شفاعت کے بالکل منکر خوارج ہیں۔ معتزلہ بھی ان دو شفاعتوں کے قائل ہیں' جبکہ اہل سنّت تو مانتے ہی ہیں۔

اولیاء اللہ کی شفاعت

تیسری شفاعت جس کے معتزلہ اور خوارج دونوں منکر ہیں لیکن اہل سنّت کے

نزدیک وہ ثابت ہے' اولیاء اللہ کی سفارش ہے۔ اور اولیاء اللہ میں چوٹی پر اللہ کے رسول' اور پھر اللہ کے نبی ہیں۔ ان کے بعد صدیقین' شہداء' صالحین' اتقیاء' سب کے سب صالحین مؤمنین اور تمام اہل ایمان بھی سفارش کریں گے۔ یہ سفارش کون سی ہو گی؟ اس سفارش کے لئے پہلے میں نے جو مثال دی تھی کہ جیسے آپ کہتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے معاف فرما دے۔ یا کوئی اللہ کے حضور دعا میں دوسرے لوگوں کے لئے بھی استغفار کرے کہ اے اللہ انہیں معاف فرما دے' جبکہ اس کا یہ تصور ہرگز نہ ہو کہ اللہ پر کسی کا زور چلتا ہے یا یہ اللہ کا نائب ہے اس لئے مختار ہے۔ نہ یہ تصور ہو کہ یہ اللہ کا ولی ہے' لاڈلا ہے اور اس کی بات اللہ ہرگز نہیں ٹالے گا۔ دیکھئے سورہ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں واضح طور پر فرما دیا گیا:

﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا﴾

''اور کہو: کل شکر اور کل ثناء اللہ ہی کے لئے ہے جس نے کسی کو نہ بیٹا بنایا' نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے اور نہ عاجزی کی بناء پر اس کا کوئی دوست ہے' اور اس کی بڑائی بیان کرو' کمال درجے کی بڑائی''۔

دنیا میں ہمارے تجربات اور مشاہدات یہ ہیں کہ ہم دوست کی بات ماننے پر مجبور ہیں' کبھی جائز و ناجائز بات کسی سے منوا لیتے ہیں۔ لیکن یہ انسانوں کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ان تمام weaknesses سے مبرّا ہے۔ وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں' اس کو کسی کی حمایت کی ضرورت نہیں' وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے اس مقام و مرتبہ کا احساس ہمہ وقت انسان کے ذہن میں رہنا چاہئے۔

اس تیسری شفاعت کے بارے میں دو چیزیں ذہن میں رکھئے۔ پہلی یہ کہ یہ شفاعت کافروں کے لئے ہرگز نہیں۔ قرآن مجید میں صراحت سے مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے باپ کے لئے بھی استغفار کی اجازت نہیں ملی تھی۔ احادیث میں موجود ہے' حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی والدہ کے لئے استغفار کی اجازت چاہی کہ اے اللہ! مجھے اجازت دے کہ میں اپنی والدہ کے لئے استغفار کر

سکوں' لیکن مجھے اس کی اجازت نہیں ملی' پھر میں نے اجازت طلب کی کہ میں اُن کی قبر کی زیارت کرسکوں' اس کی اجازت مجھے مل گئی۔ احادیثِ صحیحہ میں موجود ہے کہ جو لوگ کفر کی حالت میں مر گئے یا وہ کسی شرک میں مبتلا تھے ان کے لئے کوئی شفاعت نہیں۔ دوسرے یہ کہ منافقین کے لئے بھی شفاعت نہیں ہے' کیونکہ منافقین تو کفار سے بڑھ کر ہیں۔ قرآن مجید کی رو سے ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ ''منافقین تو آگ کے سب سے نچلے حصّے میں ہوں گے''۔ قرآن مجید میں اس ضمن میں دو آیتیں تو بہت ہی واضح ہیں اور اکثر لوگوں کو یاد بھی ہوں گی۔ سورۃ المنافقون میں فرمایا: ﴿سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ ''اے نبیؐ! ان کے حق میں بالکل برابر ہے' چاہے آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں' اللہ ان کو ہرگز معاف نہیں کرے گا''۔ اور اس سے زیادہ سخت الفاظ بھی قرآن میں ملتے ہیں: ﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ﴾ (التوبۃ: ۸۰) ''(اے نبیؐ!) آپ خواہ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں کچھ فرق نہیں پڑتا' اگر آپ ستّر مرتبہ بھی ان کے لئے استغفار کریں گے تو بھی اللہ ان کو معاف نہیں فرمائے گا''۔ اِس معاملے میں اس سے زیادہ واضح آیت کون سی ہوسکتی ہے! ہاں خود رسول اللہ ﷺ نے اس کی مزید توضیح یہ کہہ کر کر دی کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ستّر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے پر میری شنوائی ہو جائے گی تو میں اس سے زیادہ مرتبہ استغفار کرتا۔ یعنی ستر سے محض ستر کا عدد مراد نہیں' بلکہ اس سے مراد ہے کہ ان کی بخشش ناممکن ہے۔ کافر' مشرک اور منافقین کی بخشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شفاعت کا حق دار کون؟

اب وہ احادیث دیکھئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شفاعت کن کے لئے ہے۔ پہلی حدیث بخاری کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ خَالِصًا مِّنْ قَلْبِهٖ)) ''سب سے زیادہ خوش بخت میری شفاعت کے معاملہ میں

قیامت کے دن وہ ہوگا جس نے لا الٰہ الاّ اللہ خلوصِ قلب کے ساتھ کہا ہوگا''۔صرف ''مَنْ قَالَ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ''نہیں ہے' شرط ہے خلوص کے ساتھ' معاملہ غیر مشروط نہیں ہے۔اب خلوص کے ساتھ لا الٰہ الاّ اللہ کہنے کے مظاہر کیا ہوں گے؟ عملی تقاضے کیا ہوں گے؟اس کا ثبوت کیا ہوگا؟ اس کے شواہد کیا ہوں گے؟اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔اس وقت بتانا یہ مقصود ہے کہ شفاعت ہے' لیکن مشروط۔

اسی طرح مسلم شریف کی بڑی پیاری حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔فرمایا: ((لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ فَتَعَجَّلَ كُلُّ نَبِيٍّ دَعْوَتَهُ وَاِنِّي اخْتَبَأْتُ دَعْوَتِي شَفَاعَةً لِأُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) " ہر نبی کے لئے اللہ نے ایک دعا ایسی رکھی جو لازماً قبول ہوگی۔(اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خصوصی عطیہ ہے)اور ہر نبی کو جو قبولِ دعا کا خصوصی عطیہ دیا گیا وہ انہوں نے جلدی سے یعنی اس دنیا میں استعمال کرلیا(کوئی نہ کوئی دعا ایسی کر لی کہ وہ حق استعمال ہوگیا)' مگر(حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ) میں نے اپنے اس حق کو قیامت کے دن کی شفاعت کے لئے محفوظ کرلیا''۔کتنا حوصلہ افزا اور اُمید افزا معاملہ ہے۔مگر یہاں بھی آگے شرط آ رہی ہے۔آپؐ نے فرمایا: ((فَهِيَ نَائِلَةٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مَنْ مَاتَ مِنْ اُمَّتِيْ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا)) ''پس میری یہ دعا میری اُمت میں سے اس شخص کے حق میں ثابت ہو جائے گی' یعنی مفید ہو جائے گی' جو اس حال میں مرا کہ اس نے اللہ کے ساتھ کچھ بھی شرک نہ کیا ہو''۔اب دیکھئے شرک کس کس کو کہتے ہیں۔کیا شرک صرف بُت پرستی کا نام ہے؟ شرک صرف بُتوں کو سجدہ کرنے کا نام ہے؟ یہ جھنڈے کی سلامی اور قومی ترانہ کے احترام میں کھڑا ہونا بھی تو شرک ہے۔اس کا سمجھنا ذرا باریک بات ہے۔شرک نے ہمیشہ بھیس بدلے ہیں' یہ ہر دَور میں نئی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔آج کا سب سے بڑا شرک انسانی حاکمیت کا شرک ہے۔قرآن مجید میں ہے: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ﴾ ''حکم تو صرف اللہ کا ہے بلاشرکت غیرے''۔اور ﴿لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖ اَحَدًا ﴾ ''وہ کسی دوسرے کو اپنے حکم میں شریک نہیں کرتا''۔اب اپنا حال دیکھئے کہ اس میں ہم سب

شریک ہیں اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں: اے اللہ! تیری حاکمیت میں ہم شریک ہیں' بلکہ تجھ سے بھی بڑے حاکم ہیں' تیرا حکم نیچے' ہماری مرضی اوپر۔ کیا یہ شرک فِــی حُکْمِہٖ نہیں ہے؟ میں نے اس موضوع پر مفصل لیکچر دیئے ہیں جن میں خصوصاً شرک فی الذات' شرک فی الصفات اور شرک فی الحقوق کو واضح کیا ہے۔ ایک شرک دولت پرستی کا بھی ہے جس سے کون بچا ہوگا! آپ ﷺ نے فرمایا: ((تَعِسَ عَبْدُالدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ)) ''درہم و دینار کا بندہ ہلاک ہو جائے''۔ درہم و دینار کا بندہ کون ہے؟ وہ جو دولت کا پجاری ہے۔ جسے حلال وحرام کی تمیز نہیں۔ بس دولت ہونی چاہئے۔ ایسے شخص کا معبود کون ہے؟ دولت۔ اگر چہ اس کا نام عبد الرحمٰن ہو مگر حقیقت میں وہ ''عبد الدِّینار'' ہے۔ دنیا کی زندگی میں اس کی تمام تگ و دو دولت اکٹھی کرنے کی خاطر ہے۔ اس ضمن میں اسے حلال کا خیال ہے نہ حرام سے اجتناب کی کوئی فکر۔ بہر حال یہ شفاعت بھی مشروط ہے۔ چنانچہ ایسی صورت حال میں شفاعت کام نہیں آئے گی' خواہ وہ انبیاء ہوں' رسول ہوں' صلحاء ہوں یا اتقیاء ہوں۔

تیسری حدیث سنن ترمذی کی ہے' یہ صحیحین میں نہیں ہے اور یہ حضرت عوف بن مالکؓ سے مروی ہے۔ آپؐ اپنا کوئی روحانی تجربہ بیان فرما رہے ہیں:

((اَتَانِیْ آتٍ مِنْ عِنْدِ رَبِّیْ فَخَیَّرَنِیْ بَیْنَ اَنْ یُدْخِلَ نِصْفَ اُمَّتِیَ الْجَنَّۃَ وَبَیْنَ الشَّفَاعَۃِ' فَاخْتَرْتُ الشَّفَاعَۃَ' وَھِیَ لِمَنْ مَاتَ لَا یُشْرِکُ بِاللّٰہِ شَیْئًا))

''میرے پاس آیا ایک آنے والا میرے ربّ کی جانب سے (یعنی اللہ کا کوئی فرشتہ) اس نے مجھے ایک اختیار دیا کہ (اے محمدؐ! اللہ کی طرف سے آپؐ کو اختیار دیا جا رہا ہے) یا تو آپ اپنی آدھی اُمت کے جنت میں داخل ہونے کی ضمانت لے لیجئے یا پھر قیامت کے دن شفاعت کر لیجئے۔ پس میں نے شفاعت کو قبول کر لیا۔ (میں نے شفاعت کا option قبول کیا)۔ لیکن یاد رکھئے یہ شفاعت کس کے لئے ہے' کس کے حق میں مفید ہے؟ یہاں پھر حدیث کے الفاظ دیکھئے: ((لِمَنْ مَاتَ لَا یُشْرِکُ بِاللّٰہِ شَیْئًا)) ''اُس شخص کے لئے جس کی موت واقع ہوئی اس حال میں کہ اس نے اللہ کے

ساتھ شرک نہ کیا ہو''۔

اب آخری نکتہ نوٹ کر لیجئے کہ قیامت کے دن جب یہ شفاعت ہو گی تو اس کا نقشہ کیا ہوگا اور کیسے ہو گی! پہلی بات تو یہ سمجھنی چاہئے کہ اس شفاعت کا ایک فائدہ اور ایک مقصد بھی ہے کہ جب تمام نوع انسانی جمع ہو جائے گی تو اللہ اپنے بندوں میں سے اولیاء' صلحاء' اتقیاء اور انبیاء و رُسل کی قدر و منزلت کے ظہور کے لئے شفاعت کو ذریعہ بنائے گا۔ لیکن شفاعت ہو گی کس کی؟ اور کون کرے گا؟ وہ کرے گا جس کو اجازت ملے گی اور اسی کے لئے کر سکے گا جس کے لئے اجازت ملے گی۔ مگر شفاعت کنندہ کو بذریعہ الہام ان لوگوں کی اطلاع دی جائے گی جن کے حق میں شفاعت قبول ہو گی۔ کیونکہ اگر تو یہ معاملہ کھلم کھلا ہو' جیسا کہ ہمارا تصور ہے کہ مادی طور پر عدالت لگی ہوئی ہو گی اور جیسا کہ کبھی امیر خسرو نے کہا تھا ۔

خدا خود میرِ محفل بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

کوئی لامکاں کی محفل ایسی سمجھ لیجئے جس میں میرِ محفل خود اللہ تعالیٰ ہے' عدالت لگی ہوئی ہے' لامکاں میں' وہ کسی time & space میں نہیں ہے' بلکہ beyond time & space ہے۔ خسرو کہتے ہیں کہ محمد ﷺ وہاں شمع محفل تھے اور میں خود بھی اس جگہ موجود تھا۔ اب تصور کیجئے اس عدالت کا کہ عدالت منعقد ہے' مقدمات چل رہے ہیں۔ اگر اعلانیہ ایسا کہا جائے کہ فلاں کے بارے میں آپ سفارش کر سکتے ہیں تو وہ مقصد تو فوت ہو گیا۔ پھر ان کی قدر افزائی کیا ہو گی! معلوم ہوا کہ سب کچھ اللہ کی اجازت سے کیا ہے۔ جس کے لئے اللہ کی پہلے سے مرضی ہے' اس کے لئے شفاعت کی گئی ہے۔ لہٰذا یہ سب کچھ اس طور سے نہیں ہو گا جو ہم اپنے مادی مشاہدات کے تحت تصور کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ہے یُلْہِمُنِیْ یعنی اس وقت بھی الہام ہو گا' لوگوں کو معلوم نہیں ہو گا کہ فلاں شخص کے لئے محمد ﷺ کو شفاعت کی اجازت ہو گئی ہے۔ اگر تو وہاں اس طرح سے کھلم کھلا اور علی الاعلان اظہار ہو تو حضور ﷺ کا مرتبہ تو واضح نہیں ہوا' وہ تو اختیار خداوندی کا ظہور ہو گیا' وہ تو معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی

معاف فرمانا چاہتا تھا' صرف آپ ﷺ سے کہہ دیا ہے یا ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ سے کہہ دیا ہے یا شیخ عبدالقادرؒ سے کہہ دیا ہے کہ آپ اس کے لئے شفاعت کر سکتے ہیں۔ تو اس سے مقربین کی عزت افزائی کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ آخر کوئی شے بغیر مقصد کے تو نہیں ہوتی۔ پس شافعین کو مشفعین کے بارے میں بذریعہ الہام مطلع کیا جائے گا تاکہ اللہ اپنے مقربینِ بارگاہ کی قدر و منزلت اور مقام واضح کر دے' سب لوگوں پر کھل جائے کہ کس کا کیا مرتبہ ہے اور یہ اسی وقت ہو گا جب یہ سب کچھ الہام کے طور پر ہو گا۔ چنانچہ شفاعت کبریٰ والی حدیث میں ''وَيُلْهِمُنِي'' کا لفظ آیا ہے کہ ''اللہ مجھے الہام فرمائے گا''۔ اس وقت بھی جب حضور ﷺ جا کر عرش کے نیچے سجدے میں سر رکھیں گے۔ ایسا نہیں ہو گا کہ اللہ تعالیٰ dictate کرتا جا رہا ہو کہ اے محمدؐ! اس طریقہ پر میری حمد کرو' بلکہ لفظ الہام آیا ہے۔ اُس وقت اللہ کی طرف سے الہام ہو گا اور اللہ کی وہ شانیں اور اللہ کے وہ اسماء جو آج سے پہلے کسی پر نہیں کھولے گئے تھے' اللہ کے محامد و محاسن اور اسماءِ حسنٰی کے وہ خزانے محمدِ عربی ﷺ پر بطورِ الہام کھولے جائیں گے۔ اُس وقت آپؐ اللہ کی وہ حمد و ثنا کریں گے جس کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ میں آج نہیں کر سکتا' وہ تو اسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام کی جائے گی۔ جیسا کہ ابلیس اور آدم کے قصے میں آیا ہے: ﴿فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ (البقرۃ: ۳۷) آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے الہام کے ذریعے سے چند کلمات سکھا دیئے تھے۔ ان کے دل میں جذبہ تھا' پشیمانی تھی کہ خطا ہو گئی ہے' غلطی ہو گئی ہے' لیکن الفاظ نہیں تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو توبہ و استغفار کے الفاظ الہام کر دیئے۔ اسی طریقہ سے اللہ کی طرف سے الہام ہو گا۔ الہام کے ذریعے سے اولیاء اللہ' صلحاء' اتقیاء' انبیاء و رُسل اور سب سے بڑھ کر محمد رسول اللہ ﷺ شفاعت فرمائیں گے۔ لیکن کس کے لئے فرمائیں گے؟ ایک تو قانونی شکل ہے کہ اُس روز جس کے لئے اللہ کی طرف سے اجازت عطا ہو جائے' اگرچہ وہ اعلانیہ نہیں ہو گی' بطورِ الہام ہو گی اور ثانیاً جو حضور ﷺ نے ہمیں خود بتا دیا کہ میری شفاعت مفید ہو گی اس شخص کے لئے ((مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا

اللّٰہُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِہٖ)) ''جس نے لا اِلٰہ اِلّا اللہ پورے خلوصِ قلب کے ساتھ کہا ہو گا''۔ اور ((مَنْ مَاتَ مِنْ اُمَّتِیْ لَا یُشْرِکُ بِاللّٰہِ شَیْئًا)) ''جو میرا اُمّتی مرا ہو اِس حال میں کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو''۔ اللہ تعالیٰ یہ شرطیں مجھے اور آپ کو پوری کرنے کی توفیق عطا فرمائے تو پھر ہم شفاعت کے لئے ہاتھ پھیلا سکتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ کی شفاعت عطا فرما۔ وَارْزُقْنَا شَفَاعَتَہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یہ دعا کیجئے' لیکن پوری طرح امکانی حد تک محنت کیجئے۔

حاصلِ بحث

آج کی پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ ایمان کے بعد اپنی طرف سے عملِ صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر پر پورا زور رکھو' اپنی طرف سے کوئی کمی نہ ہو' کوئی کوتاہی نہ ہو' اپنی استطاعت کے مطابق پوری محنت اور کوشش کرو۔ جیسا کہ سورۃ التغابن میں فرمایا: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''اپنے امکان بھر اللہ کا تقویٰ اختیار کرو!'' میں نے شروع میں بیان کیا تھا کہ تقدیر کا مسئلہ بھی ایسا ہی نازک ہے۔ کسی نے سوال کر دیا تھا کہ حضور ﷺ! جو اللہ کی طرف سے ہے اگر وہی کچھ ہونا ہے تو پھر عمل کاہے کے لئے؟ حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: ((اِعْمَلُوْا فَکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ)) اپنی طرف سے پوری کوشش کرو۔ ہاں کر اُتنا ہی سکو گے جتنا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے' اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جس کے لئے انگریزی کا محاورہ ہے کہ You cannot grow out of your skin کہ تم اپنی کھال سے باہر تو نہیں نکل سکتے۔ کتنے موٹے ہو جاؤ' کتنے فربہ ہو جاؤ' لیکن کھال کے اندر ہی رہو گے۔ تم عمل کرتے رہو۔ باقی کیا ہوگا؟ کہاں تک پہنچ پاؤ گے؟ اس کا ہمیں علم نہیں۔ ہم نے اگر اپنی امکانی حد تک چلنے کی کوشش کی ہے تو جہاں تک پہنچ گئے اللہ قبول فرمائے گا۔ چھت تک کیوں نہیں پہنچے؟ ہمارے اندر ہمت نہیں تھی اس لئے چھت تک نہیں پہنچ سکے۔ لیکن اگر آپ نے اپنی کوشش میں کوئی کمی کی ہے تو آپ مارے گئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ امکان بھر زور عمل صالح پر ہو۔ اور یہی درحقیقت آیۃ الکرسی سے پہلی والی آیت کا حاصل ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (البقرة: ۲۵۴)

''اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی' نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ اور ظالم اصل میں وہ ہیں جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں''۔

پھر اپنی ساری امکانی محنت کے باوجود نہ تو اپنے عمل پر اور اپنی نیکی پر گھمنڈ ہو' کیونکہ گھمنڈ ہو گیا تو برباد ہو جائیں گے' یعنی زیرو سے ضرب کھا جائیں گے' نہ عمل پر بھروسہ ہو' اس لئے کہ وہ حدیث بھی سامنے رہے کہ کوئی شخص محض اپنے عمل کی بناء پر جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اگر حضور ﷺ خود اپنے بارے میں فرمادیں ((اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِفَضْلٍ وَّرَحْمَۃٍ)) تا بہ دیگراں چہ رسد؟ کسی اور کا معاملہ کیا ہو گا؟ پھر اللہ کی مغفرت کے امیدوار بھی رہو' خواستگار بھی رہو اور اولیاء اللہ' انبیاء' صلحاء' اتقیاء اور ملائکہ کی شفاعت کے امیدوار بھی رہو۔ ملائکہ کے بارے میں قرآن مجید میں بار بار آتا ہے کہ اہل ایمان کے لئے استغفار کرتے رہتے ہیں کہ اے اللہ ان کو بخش دے۔ چنانچہ وہ تو شفاعت اب بھی کر رہے ہیں۔ شفاعت تو ہو رہی ہے' ان سب کی شفاعت کے امیدوار رہو۔ لیکن کسی کے سامنے کسی کا نام لے کر درخواست کبھی نہ کرنا۔ وہ شرک ہو جائے گا ((لَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا)) اللہ کے سوا پکارنا کسی کو نہیں' نہ جبرائیلؑ کو' نہ میکائیلؑ کو' نہ اسرافیلؑ کو' نہ محمد ﷺ کو' نہ علیؓ کو' نہ ابوبکرؓ کو' نہ کسی اور کو۔ خواستگاری صرف اللہ سے۔ لیکن امیدواری کے لئے دعائیہ کلمات ہیں : وَارْزُقْنَا شَفَاعَتَہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اے اللہ! ہمیں محمد ﷺ کی شفاعت میں سے حصہ عطا فرمائیے' ہمیں اس شفاعت کا مصداق بنا دے' ہمیں واقعتاً خلوصِ قلب سے مؤمن بنا دے اور ہمیں واقعتاً ہر نوع کے شرک سے پاک کر دے' تاکہ ہم روزِ قیامت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے مستحق ہو سکیں۔ آمین یا ربّ العالمین

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(ترتیب و تسوید: ڈاکٹر ایف۔ ایم۔ ناز ر پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)

ملّتِ بیضا پر ایک عُمرانی نظر

تالیف: علّامہ شیخ محمد اقبال

یہ خطبہ علامہ محمد اقبال مرحوم نے ۱۹۱۰ء کے اواخر میں ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں بزبانِ انگریزی دیا تھا جس میں اُس زمانے کے احوال وظروف کے حوالے سے اسلامیانِ ہند کی عمرانی صورت حال کا جائزہ لیا گیا تھا۔ پنجاب کے احباب کی خواہش پر مولانا ظفر علی خان مرحوم نے اقبال کے اس انگریزی خطبے کو اردو کے قالب میں ڈھالا اور ۱۹۱۱ء کے اوائل میں برکت علی اسلامیہ ہال (بیرون موچی دروازہ) لاہور کے جلسہ عام میں، جس میں علامہ اقبال بھی شریک ہوئے تھے، اپنے انداز خاص میں پڑھ کر سنایا۔ بعدازاں یہ خطبہ ''پنجاب ریویو'' کے مارچ اپریل ۱۹۱۱ء کے مشترکہ شمارہ میں افتتاحی مضمون کے طور پر نذر قارئین کیا گیا۔ علی گڑھ کے اس خطبے کو بجا طور پر افکار اقبال کے آئندہ تعمیر ہونے والے قصر رفیع الشان کی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے اس خطبے میں اُس وقت کے لحاظ سے آخر میں صرف دو اہم قومی مسائل یعنی تعلیم اور اقتصاد کو موضوع بحث بنایا ہے مگر عمرانی نقطۂ نظر سے اسلامی قومیت کے اساسی پہلوؤں پر جو فکر انگیز باتیں انہوں نے کہی ہیں وہ ان کے بنیادی افکار کی تمہید ہیں۔ قومی تعلیم اور اس کے ساتھ وابستہ قومی کلچر کا مسئلہ اس لحاظ سے قابل غور ہے کہ جو باتیں اقبال نے اس خطبے میں بیسویں صدی کے شروع میں اس وقت کے منظر کے حوالے سے کہیں وہ آج اکیسویں صدی کے آغاز پر ہمارے لئے ایک اذیت ناک مسئلہ بن چکی ہیں اور افسوس ناک امر یہ ہے کہ ہم اس خطرے کے احساس سے بھی بے نیاز ہو چکے ہیں۔ مفکر پاکستان اور مبشر پاکستان علامہ اقبال کا یہ خطبہ اسی مقصد کی خاطر شائع کیا جا رہا ہے کہ شاید افکارِ اقبال کی روشنی ان تاریک لمحات میں ہمیں صراط مستقیم دکھا سکے اور ان خطرات سے ہمیں آگاہ کر سکے جن میں ہم اس وقت گھرے ہوئے ہیں۔ یہ خطبہ بزم اقبال لاہور کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

انسانی تاریخ کے پارینہ اوراق کو لوٹتے وقت جب ہماری نظر اِرتقاء کی اَلم ریز جھلملیوں میں سے چھنتی ہوئی ان کے رزمیہ بین السطور پر پڑتی ہے تو کسی خواب کے گریز پا نظاروں کی طرح ہم گزری ہوئی قوموں اور سلطنتوں اور تمدّنوں کے کھنڈروں

کو پَے بہ پَے نیست سے ہست اور ہست سے نیست ہوتا دیکھتے ہیں جس سے زیادہ ہیبت افزا اور حوصلہ فرسا منظر اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ قدرت کی قوّتوں کی نظروں میں نہ افراد کی وقعت ہے نہ اقوام کی منزلت۔ اس کے اٹل قوانین برابر اپنا عمل کئے جا رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کی منزلِ مقصود بہت ہی دُور ہے جسے مقاصدِ انسانی کے آغاز و انجام سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ لیکن ع ''آدمی زادہ طرفہ معجونیست''۔

باوجود حالاتِ گرد و پیش کی نامساعدت کے اس کی تخیل جو عقل کی آئینہ بردار ہے اسے اپنی ہستی کا کامل تر جلوہ دکھا دیتی ہے اور ان ذرائع کی دریافت پر آمادہ کرتی ہے جو اس تصویرِ مثالی میں جس کے خط و خال اس کی شان اکملیّت کو چھپائے ہوئے ہیں' جان ڈال سکیں۔ دوسرے حیوانات کے مقابلے میں انسان بہت ہی کمزور و ناتواں ہے۔ اپنے بچاؤ کے لئے وہ قدرتی حربوں سے مسلح نہیں کیا گیا۔ وہ بصارتِ شبینہ سے محروم ہے۔ اس کی قوّتِ شامہ اور طاقتِ گریز بہت کم ہے۔ لیکن پھر بھی زندگانی کی آزادیوں اور پہنائیوں کی جستجو میں اس نے اپنی انتھک سرگرمیوں کو ہمیشہ سے وقف کئے رکھا ہے تاکہ قوانین قدرت کی کُنہ اور طرزِ عمل سے واقف ہوکر وہ رفتہ رفتہ ان اسباب پر حاوی ہو جائے جو خود اس کے ارتقاء پر مؤثر ہیں۔

قانونِ انتخابِ قدرت کے اکتشافِ عظیم کی بدولت انسان اپنے خانوادہ کی تاریخ کا عقلی تصور قائم کرنے کے قابل ہو گیا' حالانکہ پہلے اس تاریخ کے واقعات کی حیثیت اس کے نزدیک حوادث کے ایک فوق الادراک سلسلہ سے زیادہ نہ تھی جو بلا کسی اندرونی ترتیب یا غایت کے فرداً فرداً مادرِ ایام کے سراپا اسرار بطن سے پیدا ہوکر گہوارۂ شہود میں اٹھکیلیاں کرتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے۔ اس قانون کے معانی کی تنقید جب اور بھی زیادہ دِقّتِ نظر کے ساتھ کی گئی اور اُن فلاسفہ نے جن کی خیال آفرینیاں ڈارون کے مقدمۂ حکمت کا تتمہ ہیں جب حیات کی ہیئتِ اجتماعی کے دوسرے نمایاں حقائق کا اکتشاف کیا تو مدنی زندگی کے عُمرانی' اَخلاقی' اِقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کے متعلق انسان کے تصورات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہونے کی صورت نکل آئی۔

علم الحیات کے اصولوں نے حال میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ فرد فی نفسہٖ

ایک ہستی اعتباری ہے یا یوں کہئے کہ اس کا نام ان مجردات عقلیہ کی قبیل سے ہے جن کا حوالہ دے کر عُمرانیات کے مباحث کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر دی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر فرد اس جماعت کی زندگی میں جس کے ساتھ اس کا تعلق ہے' بمنزلہ ایک عارضی و آنی لمحہ کے ہے۔ اس کے خیالات' اس کی تمنائیں' اس کا طرزِ ماندو بود' اس کے جملہ قوائے دماغی و جسمانی' بلکہ اس کے ایّامِ زندگانی کی تعداد تک اس جماعت کی ضروریات وحوائج کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جس کی حیاتِ اجتماعی کا وہ محض ایک جزوی مظہر ہے۔ فرد کے افعال کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ بر سبیلِ اضطرار و بلا ارادہ کسی ایک خاص کام کو جو جماعت کے نظام نے اس کے سپرد کیا ہے انجام دے دیتا ہے اور اس لحاظ سے اس کے مقاصد کو جماعت کے مقاصد سے تخالفِ کلی بلکہ تضادِ مطلق ہے۔ جماعت کی زندگی بلا لحاظ اپنے اجزائے ترکیبی یعنی افراد کی زندگی کے بالکل جداگانہ ہوتی ہے' اور جس طرح ایک جسمِ ذوی الاعضاء مریض ہونے کی حالت میں بعض دفعہ خود بخود بلا علم و بلا ارادہ اپنے اندر ایسی قوتوں کو برانگیختہ کر دیتا ہے جو اس کی تندرستی کا موجب بن جاتی ہیں اسی طرح ایک قوم جو مخالف قوتوں کے انحطاط آور اثرات سے سقیم الحال ہو گئی ہو بعض دفعہ خود بخود ردِ عمل کرنے والی قوتوں کو پیدا کر لیا کرتی ہے۔ مثلاً قوم میں کوئی زبردست دل و دماغ کا انسان پیدا ہو جاتا ہے یا کوئی نئی تخییل نمودار ہوتی ہے یا ایک ہمہ گیر مذہبی اصلاح کی تحریک بروئے کار آتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قوم کے قوائے ذہنی و روحانی تمام طاغی و سرکش قوتوں کو اپنا مطیع و منقاد بنانے اور اس موادِ فاسد کو خارج کر دینے سے جو قوم کے نظام جسمانی کی صحت کے لئے مضر تھا قوم کو نئے سرے سے زندہ کر دیتے ہیں اور اس کی اصلی توانائی اس کے اعضاء میں عود کر آتی ہے۔ اگرچہ قوم کی ذہنی و دماغی قابلیت کا دھارا افراد ہی کے دماغ میں سے ہو کر بہتا ہے لیکن پھر بھی قوم کا اجتماعی نفس ناطقہ جو مدرک کلیاتِ و جزئیات اور خبیر و مرید ہے' بجائے خود ضرور موجود ہوتا ہے۔ ''جمہوری رائے'' اور ''قومی فطنت'' وہ جملے

ہیں جن کی وساطت سے ہم موہوم و مبہم طور پر اس نہایت ہی اہم حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ قومی ہستی ذوی العقل اور ذوی الارادہ ہے۔ اژدہامِ خلائق‘ جلسۂ عام‘ جماعتِ انتظامی‘ فرقۂ مذہبی اور مجلسِ مشاورت وہ مختلف ذرائع ہیں جن سے قوم اپنی تدوین و تنظیم کا کام لے کر وحدتِ ادراک کی غایت کو حاصل کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ قومی دماغ تمام ان مختلف خیالات کی خبر یا علم رکھتا ہو جو ایک وقت خاص میں افراد کے دماغوں میں موجود ہوتے ہیں‘ اس لئے کہ خود افراد کا دماغ بھی کامل طور پر اپنی ادراکی حالتوں سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اجتماعی یعنی قومی دماغ میں بہت سے احساسات و مقامات و تخیلات قومی حاسہ کی دہلیز کے باہر رہتے ہیں۔ قوم کی ہمہ گیر دماغی زندگی کا فقط ایک جزِ محدود دروازہ کے اندر قدم رکھتا ہے اور قومی ادراک کی تابناک شعاعوں سے منور ہوتا ہے۔ اس انتظام کی بدولت مرکزی اعضا کی توانائی کی ایک بہت بڑی مقدار غیر ضروری جزئیات پر صرف ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ قوم ایک جداگانہ زندگانی رکھتی ہے۔ یہ خیال کہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ اپنے موجودہ افراد کا محض ایک مجموعہ ہے‘ اصولاً غلط ہے۔ اور اسی لئے تمدنی و سیاسی اصلاح کی تمام وہ تجاویز جو اس مفروضہ پر مبنی ہوں بہت احتیاط کے ساتھ نظر ثانی کی محتاج ہیں۔ قوم اپنے موجودہ افراد کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ کر ہے۔ اس کی ماہیت پر اگر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ غیر محدود و لامتناہی ہے۔ اس لئے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ کثیر التعداد آنے والی نسلیں بھی شامل ہیں جو اگرچہ عُمرانی حدِ نظر کے فوری منتہا کے پرلی طرف واقع ہیں لیکن ایک زندہ جماعت کا سب سے زیادہ اہم جز و متصور ہونے کے قابل ہیں۔ علم الحیات کے اکتشافاتِ جدیدہ نے اس حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا ہے کہ کامیاب حیوانی جماعتوں کا حال ہمیشہ استقبال کے تابع ہوتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے اگر نوع پر نظر ڈالی جائے تو اس کے وہ افراد جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اس کے موجودہ افراد کے مقابلہ میں شاید زیادہ بدیہی الوجود ہیں۔ موجودہ

افراد کی فوری اغراض ان غیر محدود و نامشہود افراد کی اغراض کے تابع بلکہ ان پر نثار کر دی جاتی ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ بتدریج ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور علم الحیات کی اس حیرت انگیز حقیقت کو وہ شخص بنگاہِ استغنا نہیں دیکھ سکتا جس کے پیش نظر سیاسی یا تمدنی اصلاح ہے۔ میں اپنی قوم کی موجودہ عُمرانی حرکت پر اسی پہلو سے نظر ڈالنا چاہتا ہوں، یعنی اس کی تنقید استقبالی طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اقوام کے لئے سب سے زیادہ مہتم بالشان عقدہ فقط یہ عقدہ ہے (خواہ اس کی نوعیت تمدنی قرار دی جائے خواہ اقتصادی خواہ سیاسی) کہ قومی ہستی کا سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے۔ مٹنے یا معدوم ہو جانے کے خیال سے قومیں بھی ویسی ہی خائف ہیں جیسے افراد۔ کسی قوم کی مختلف عقلی یا غیر عقلی قابلیتوں اور استعدادوں کے محاسن کا اندازہ ہمیشہ اسی غایت الغایات سے کرنا چاہئے۔ ہم کو لازم ہے کہ اپنے محاسن کو جانچیں اور پرکھیں اور اگر ضرورت آ پڑے تو نئے محاسن پیدا کریں۔ اس لئے کہ بقول نطشے کے کسی قوم کی بقا کا دارومدار محاسن کی مسلسل و غیر مختتم تولید پر ہوتا ہے۔ کائنات یقیناً جناب باری کی حکمت بالغہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر اس کا مفہوم سرتاسر انسانی ہے۔ لیکن اس تبصرہ کے آغاز سے پہلے میں چند تمہیدی امور پر بحث کرنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ یہ بحث میرے نزدیک جماعتِ مسلمین کے متعلق کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ امور جن پر میں ترتیب وار نظر ڈالوں گا، حسب ذیل ہیں:

(۱) جماعت مسلمین کی ہیئت ترکیبی۔

(۲) اسلامی تمدن کی یک رنگی۔

(۳) اُس سیرت کا نمونہ جو مسلمانوں کی قومی ہستی کے تسلسل کے لئے لازمی ہے۔

اولاً: مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے، نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآب ﷺ نے قائم فرمائی تھی اس لئے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی

روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بے زاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کی اساس ایک خالص تنزیہی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہے جس میں بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائل مخصوصہ وشمائل مختصہ پر نہیں ہے۔ غرض اسلام زمان ومکان کی قیود سے مبرّا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قومِ عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا' اس کی پولٹیکل نشو ونما میں بہت بڑا حصہ لیا لیکن اسلامی علوم وفنون اور فلسفہ وحکمت کے انمول موتیوں کے رولنے کا کام' اور یہ وہ کام ہے جو نفسِ ناطقہ انسانی کی اعلیٰ زندگی کے کارناموں سے متعلق ہے' زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے انجام دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کا ظہور قومِ عرب کی زندگی کی تاریخ میں یزدان طلبی کی ایک آنی و عارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق کی چشمک تھی یا شرار کا تبسم تھا۔ لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کا جولانگاہ عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا۔ پس چونکہ اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خالص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے لہٰذا کیونکر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو کسی خارجی یا حسی اصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز متصور کرے۔ قومیت کا ملکی تصور جس پر زمانۂ حال میں بہت حاشیے چڑھائے گئے ہیں' اپنی آستین میں اپنی تباہی کے جراثیم کو خود پرورش کر رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قومیت کے جدید تصور نے چھوٹے چھوٹے پولٹیکل حلقے قائم کر کے اور ان میں رقابت کے اس صحیح القوام عنصر کو پھیلا کر جس نے تمدنِ جدیدہ کی شاخ میں بوقلمونی کا پیوند لگایا ہے' دنیا کو تھوڑا بہت فائدہ ضرور پہنچایا ہے۔ لیکن بڑی خرابی اس تصور میں یہ ہے کہ اس میں غلو اور افراط کا شاخسانہ نکل آتا ہے۔ اس نے بین الاقوامی نیّتوں کی نسبت غلط فہمی پھیلا رکھی ہے۔ اس نے پولٹیکل سازشوں اور منصوبہ بازیوں کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس نے فنون لطیفہ وعلوم ادبیہ کو خاص خاص قوموں کی خصوصیات کی میراث قرار دے کر عام انسانی عنصر کو اس میں سے نکال دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال جو قومیت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے' ایک طرح سے

ایک مادی شے کا تالیہ ہے جو سراسر اصولِ اسلام کے خلاف ہے' اس لئے کہ اسلام دنیا میں ہر طرح کے شرکِ خفی و جلی کا قلع و قمع کرنے کے لئے نمودار ہوا تھا۔ لیکن اس سے یہ نہ گمان کیا جائے کہ میں جذبۂ حبِ وطن کا سرے سے مخالف ہوں۔ ان قوموں کے لئے جن کا اتحاد حدود ارضی پر مبنی ہو' اس جذبہ سے متاثر ہونا ہر طرح سے حق بجانب ہے۔ لیکن مَیں ان لوگوں کے طرزِ عمل کا یقیناً مخالف ہوں جو اس امر کے معترف ہونے کے باوجود کہ جذبۂ حبِ وطن قومی سیرت کا ایک قیمتی عنصر ہے' ہم مسلمانوں کی عصبیت کو نام دھرتے ہیں اور اسے وحشیانہ تعصّب کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ ہماری عصبیت ایسی ہی حق بجانب ہے جیسی ان کی وطن پرستی۔ عصبیت سے بجز اس کے اور کچھ مراد نہیں کہ اصول حبِّ نفس بجائے اس کے کہ ایک فردِ واحد میں ساری و دائر ہو' ایک جماعت پر اپنا عمل کرتا ہے۔ حیوانات کی تمام نوعیں کم و بیش ضرور متعصب ہوتی ہیں اور اگر انہیں اپنی انفرادی یا اجتماعی ہستی برقرار رکھنی ہے تو ضرور ہے کہ ان میں عصبیت موجود ہو۔ اقوام عالم پر نظر ڈالئے۔ ایک قوم بھی ایسی نہ ہوگی جو پیرایۂ عصبیت سے عاری ہو۔ کسی فرانسیسی کے مذہب پر نکتہ چینی کیجئے۔ وہ بہت ہی کم متاثر ہوگا' اس لئے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اس اصول کو مَس نہیں کیا جو اس کی قومیت کی روح رواں ہے۔ لیکن ذرا اس کے تمدن' اس کے ملک یا پولٹیکل سرگرمیوں کے کسی شعبہ کے متعلق اس کی قوم کے مجموعی طرزِ عمل یا شعار پر تو خردہ گیری کر دیکھئے' پھر اس کی جبلی عصبیت کا شعلہ بھڑک نہ اٹھے تو ہم جانیں۔ بات یہ ہے کہ فرانسیسی کی قومیت کا انحصار اس کے معتقداتِ مذہبی پر نہیں ہے بلکہ جغرافیائی حدود یعنی اس کے ملک پر ہے۔ پس جب آپ اس خاص خطۂ زمین پر جسے اس نے اپنے تخیل میں اپنی قومیت کا اصل اصول قرار دے رکھا ہے معترض ہوتے ہیں تو آپ اس کی عصبیت کو واجبی طور پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت ایک شے معہود فی الذہن ہے موجود فی الخارج نہیں ہے۔ بلحاظ ایک قوم ہونے کے ہم جس مرکز پر آ کر جمع ہو سکتے ہیں وہ مظاہرِ

آفرینش کے متعلق ایک خاص قسم کا اشراقی سمجھوتا ہے جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے۔ پس اگر کسی کا ہمارے مذہب کو برا کہنا ہماری آتشِ عصبیت کو برافروختہ کرتا ہے تو میری دانست میں یہ برافروختگی اس فرانسیسی کے غصہ سے کچھ کم واجبی نہیں ہے جو اپنے وطن کی برائیاں سن کر بھڑک اٹھتا ہے۔ عصبیت سے صرف قومی پاس داری مراد ہے' دوسری اقوام کو بنگاہِ تنفر دیکھنا اس کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ بزمانۂ قیام انگلستان جب کبھی مجھے کسی خاص مشرقی رسم یا طرزِ خیال کو کسی انگلش لیڈی یا جنٹلمین کے سامنے بیان کرنے کا اتفاق ہوا تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس پر اظہار تعجب نہ کیا گیا ہو۔ جس سے مجھے رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے نزدیک ہر غیر انگلش خیال گویا داخل عجائباتِ قدرت ہے۔ مجھے انگریزی قوم کا یہ وطیرہ نہایت ہی پسند ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ قوم پیرایۂ تخیل سے عاری ہے۔ جس خاک سے شیکسپیئر' شیلے' کیٹس' ٹنی سن اور سوئنبرن پیدا ہوئے ہوں وہ بھلا خیال آفرینیوں اور ذہانت آرائیوں سے کیونکر معرّا ہوسکتی ہے۔ البتہ یہ بات ہمیں ماننی پڑتی ہے کہ انگلستان کا طریقۂ ماندو بود اور طرزِ غور و فکر وہاں کے آئین و قوانین اور اس کے رسم و رواج اس ملک کے رہنے والوں کی زندگی کے اجزائے لاینفک بن گئے ہیں۔

غرض مذہبی خیال بلا اس دینی اکتناز کے جو افراد کی آزادی میں غیر ضروری طور پر خلل انداز ہو اسلامی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا مدار علیہ ہے۔ آگسٹس کونٹ کا قول ہے کہ "چونکہ مذہب ہماری کل ہستی پر حاوی ہے لہٰذا اس کی تاریخ ہماری نشو و نما کی پوری تاریخ کا خلاصہ ہونی چاہئے"۔ یہ قول جیسا ہماری قوم پر صادق آتا ہے ویسا کسی اور قوم پر نہیں صادق آتا۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر اسلامی جماعت کی ہیئتِ ترکیبی کا انتہائی مدار علیہ محض وہ چند معتقدات ہیں جن کی نوعیت مابعد الطبیعی ہے تو کیا یہ بنیاد نہایت ہی متزلزل نہیں ہے؟ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ علوم جدیدہ تیز پا ترقی کر رہے ہیں اور ہر بات کے حسن و قبح کو پرکھنا اور معقولات اور منطقی استدلال سے قدم قدم پر کام لینا ان علوم کا لازمہ قرار دیا گیا ہے۔ مشہور فرانسیسی مستشرق رینان

کا یہی خیال تھا اور دبے الفاظ میں اس نے یہ اُمید ظاہر کی تھی کہ اسلام ایک دن دنیا کے ایک بڑے حصے کی عقلی و اخلاقی پیشوائی کے منصب اعلیٰ سے گر جائے گا۔ جن اقوام کی اجتماعی زندگی کا اصل اصول حدود ارضی سے وابستہ ہو انہیں معقولات سے خائف نہ ہونا چاہئے۔ لیکن ہمارے حق میں یہ ایک خطرناک دشمن ہے' اس لئے کہ یہ اسی اصول کو مٹانا چاہتا ہے جس پر ہماری قومی ہستی مبنی ہے اور جس نے ہمارے اجتماعی وجود کو قابل فہم بنا رکھا ہے۔ تعقل دراصل تجزیہ ہے اور اسی لئے معقولات سے اس قومی شیرازہ کے بکھر جانے کا اندیشہ ہے جو مذہبی قوت کا باندھا ہوا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ہم معقولات کا توڑ عقلی حربوں سے کر سکتے ہیں لیکن میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعتقاد یعنی ہمہ گیر وفاق کا وہ نکتہ جس پر ہماری جماعت کی وحدت منحصر ہے' ہمارے لئے اپنے مفہوم کے لحاظ سے عقلی نہیں بلکہ قومی ہے۔ مذہب کو فلسفۂ نظری بنانے کی کوشش کرنا' میری رائے میں بے سود محض بلکہ لغو و مہمل ہے' اس لئے کہ مذہب کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انسان بیٹھا ہوا زندگی کی حقیقت پر غور کیا کرے' بلکہ اس کی اصلی غایت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لئے ایک مربوط و متناسب عُمرانی نظام قائم کیا جائے۔ مذہب سیرتِ انسانی کا ایک نیا اسلوب یا نمونہ پیدا کر کے اس شخص کے اثر کے لحاظ سے جو اس سیرت کا مظہر ہے' اس نمونہ کو دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے اور اس طور پر چونکہ وہ ایک نئی دنیا کو نیست سے ہست کرتا ہے لہٰذا اس پر مابعد الطبیعیات کا اطلاق ہوتا ہے۔ میری مراد ان تمام باتوں سے جو اوپر بیان کی گئی ہیں یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت ہمارے لئے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے' بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک کہ ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے' وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس

روایات کی اصطلاح میں خدا کی مٹی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔

ثانیاً: معتقداتِ مذہبی کی وحدت جس پر ہماری قومی زندگی کا دار و مدار ہے اگر مضاف سے تعبیر کی جائے تو اسلامی تہذیب کی یک رنگی بمنزلہ اس کے مضاف الیہ کے ہے۔ محض اسلام پر ایمان لے آنا اگرچہ نہایت ہی ضروری ہے لیکن کافی و مکتفی نہیں ہے۔ قومی ہستی میں شریک ہونے کی غرض سے ہر فرد کے لئے قلب ماہیت لازمی ہے اور اس قلب ماہیت کے لئے خارجی طور پر تو ارکان وقوانین اسلام کی پابندی کرنی چاہیئے اور اندرونی طور پر اس یک رنگ تہذیب و شائستگی سے استفادہ کرنا چاہیئے جو ہمارے آباء و اجداد کی متفقہ عقلی تحریک کا ماحصل ہے۔ اسلامی جماعت کی تحریک پر جس قدر زیادہ غور کیا جائے گا اسی قدر یہ تاریخ حیرت انگیز و تعجب انگیز نظر آئے گی۔ اس دن سے جبکہ اسلام کا سنگ بنیاد رکھا گیا سولہویں صدی کے آغاز تک یعنی تقریباً ایک ہزار سال کا زمانہ اس بے چین قوم نے ملک گیریوں اور جہاں کشائیوں میں صرف کیا۔ اگرچہ اس ہمہ گیر مشغلہ میں منہمک ہونے کے باعث انہیں کسی دوسرے شغل کی فرصت نہ ہوسکتی تھی لیکن پھر بھی اسلامی دنیا نے علم و حکمت کے قدیم خزانوں کو ڈھونڈ نکالا اور ان پر اپنی طرف سے معتدبہ اضافہ کر کے ایک عدیم النظیر لٹریچر کا سرمایہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس کے علاوہ ایک ایسے جامع و مانع نظامِ فقہ کو مدوّن کیا جو اسلامی تمدن کا غالباً سب سے زیادہ گراں مایہ ترکہ ہے۔ جس طرح جماعت مسلمین ان اختلافات کو جن کی بنا رنگ و خون پر ہو تسلیم نہیں کرتی اور دنیا کی تمام نسلوں کو انسانیت کے ہمہ گیر خیال کی سلک میں منسلک کرنا اپنی غایت سمجھے ہوئے ہے اسی طرح مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی کا معیار بھی عالم گیر ہے اور اس کا وجود اور نشو و نما کسی ایک قوم خاص کی دماغی قابلیتوں کا مرہون منت نہیں ہے۔ البتہ ایران اس تہذیب و شائستگی کی نشو و نما کا جزوِ اعظم قرار پا سکتا ہے۔ اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ تاریخ اسلام کا سب سے زیادہ اہم واقعہ کون سا ہے تو میں بلا تامل اس کا یہ جواب دوں گا کہ فتح ایران۔ معرکہ نہاوند

نے عربوں کو نہ صرف ایک دلفریب سرزمین کا مالک بنا دیا بلکہ ایک قدیم قوم پر مسلط کر دیا جو سامی اور آریہ مسالے سے ایک نئے تمدن کا محل تعمیر کرنے کی قابلیت رکھتی تھی۔ ہمارا اسلامی تمدن سامی تفکر اور آریہ تخیل کے اختلاط کا ماحصل ہے۔ جب ہم اس کے خصائل وشمائل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نزاکت اور دلربائی اسے اپنی آریہ ماں کے بطن سے اور اس کا وقار و متانت اسے اپنے سامی باپ کے صلب سے ترکہ میں ملا ہے۔ فتح ایران کی بدولت مسلمانوں کو وہی گراں مایہ متاع ہاتھ آئی جو تسخیر یونان کے باعث اہل روما کے حصہ میں آئی تھی۔ اگر ایران نہ ہوتا تو ہمارے تمدن کی تصویر بالکل یک رخی ہوتی۔

یہاں ضمناً اس امر کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ قوم جس کے اختلاط نے عربوں اور مغلوں کی شکل ہی بدل دی، عقلی وادراکی لحاظ سے مردہ نہیں ہے۔ ایران جس کی پولٹیکل آزادی کو روس کی غاصبانہ آرزوؤں نے معرضِ خطر میں ڈال رکھا ہے ابھی تک اسلامی تہذیب کا ایک بڑا مرکز ہے۔ اور ہم لوگوں کی دلی تمنا ہے کہ اسلامی دنیا میں اس کا وہ درجہ جو اَب تک قائم رہتا چلا آیا ہے بدستور قائم رہے۔ ایران کے شاہی خاندان کے لئے ایران کی پولٹیکل آزادی کا فقدان فقط اس کا ہم معنی ہوگا کہ زمین کا ایک ٹکڑا اس کے قبضہ سے نکل گیا لیکن اسلامی تہذیب کے لئے یہ واقعہ تیرھویں صدی کے تاتاری حملہ سے بھی زیادہ بلاخیز ومصیبت انگیز ہوگا۔ بہر حال یہ ایک پولٹیکل بحث ہے جس میں مَیں اس وقت نہیں پڑنا چاہتا۔ مَیں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جماعت مسلمین کا زندہ رکن بننے کے لئے انسان کو مذہب اسلام پر بلاشرط ایمان لانے کے علاوہ اسلامی تہذیب کے رنگ میں اپنے تئیں پوری طرح سے رنگنا چاہئے۔ ''صبغة اللہ'' کے اس خُم میں غوطہ لگانے کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان دورنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جائیں۔ ان کا ذہنی منظر ایک ہو۔ وہ مظاہر آفرینش پر ایک خاص پہلو سے نظر ڈالیں۔ اشیاء کی ماہیت اور قدر وقیمت کو اس انداز خاص کے ساتھ جانچیں جو جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں کا مابہ الامتیاز ہے اور جو مسلمانوں کو ایک غایتِ مخصہ اور مقصدِ معیّنہ

کے پیرائے سے آراستہ کر کے انہیں ''کل مؤمنین اخوۃ'' کی کتاب کے اوراق بنا دیتا ہے۔

ثالثاً: شق ثانی کے تحت ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اسلامی سیرت کے نمونہ کی نمایاں خصوصیات کیا کیا ہونی چاہئیں۔ لیکن یہ بتا دینا ضروری ہے کہ سیرت کے وہ مختلف نمونے جنہیں ایک قوم پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے' بخت و اتفاق کی کورانہ قوّتوں ہی کا ماحصل نہیں ہیں۔ زمانہ حال کا علم عُمرانیات ہمیں یہ نکتہ سکھاتا ہے کہ قوموں کا اخلاقی تجربہ خاص خاص قوانینِ معیّنہ کا تابع ہوا کرتا ہے۔ زمانہ قبل تاریخ میں جب کہ زندہ رہنے کے لئے انسان کو سخت جِدّوجُہد کرنی پڑتی تھی اور دماغی قابلیتوں کے مقابلہ میں وہ جسمانی قوّتوں سے زیادہ کام لیتا تھا تو اسی شخص کی سب تعریف وتقلید کرتے تھے جو شجاع ہوتا تھا۔ جب جہد للبقاء کی کشمکش فرو ہوئی اور خطرہ زائل ہو گیا تو دورِ شجاعت گیا اور باصطلاح گڈنگس دورِ مروّت آیا جس میں جرأت و دلاوری اگرچہ پھر بھی مستحسن سمجھی جاتی تھی لیکن انسانی سیرت کا ہر دلعزیز اور عام پسند نمونہ وہ شخص متصور ہوتا تھا جو نشاطِ عمر کی ہر صنف کا رسیا ہو اور فیاضی وایثار اور ہم نوالگی وہم پیالگی کے گوناگوں اوصاف سے متصف ہو۔ لیکن چونکہ ان دونوں اسالیب کا میلان غلو وافراط کی جانب تھا لہٰذا ان کے عمل کا ردّ ایک تیسرے نمونہ یا اسلوب نے کیا جس کی غایت الغایات ضبطِ نفس ہے اور جو زندگی پر زیادہ متانت وتقشّف کے ساتھ نظر ڈالتا ہے۔

ہندوستان میں جب ہم اسلامی جماعت کے ارتقاء کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں تیمور اُسلوبِ اوّل کا مظہر نظر آتا ہے۔ بابر اسالیب اوّل ودوم کے امتزاج کو ظاہر کرتا ہے۔ جہانگیر اسلوبِ ثانی کے سانچے میں خصوصیت کے ساتھ ڈھلا ہوا ہے اور عالمگیر جس کی زندگی اور کارنامے میری دانست میں ہندوستان کی اسلامی قومیت کی نشوونما کا نقطۂ آغاز ہیں' اسلوبِ ثالث کا چہرہ کشا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک جنہوں نے عالمگیر کے حالات تاریخ ہند کے مغربی شارحین کی زبانی سنے ہیں' عالمگیر کا نام

سفّا کی و قساوت' جبر و استبداد' مکّاری و غدّاری اور پولٹیکل سازشوں اور منصوبوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ خلطِ مبحث کا خوف مانع ہے ورنہ مَیں متعاصرانہ تاریخ کے واقعات کی صحیح تعبیر و تفسیر سے ثابت کرتا کہ عالمگیر کی پولٹیکل زندگی کی وجوہ تحریک سراسر جائز و حق بجانب تھیں۔ اس کے حالات زندگی اور اس کے عہد کے واقعات کا بنظر انتقاد مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یقین واثق ہو گیا ہے کہ جو الزامات اس پر لگائے جاتے ہیں وہ واقعاتِ متعاصرہ کی غلط تعبیر اور ان تمدنی و سیاسی قوّتوں کی غلط فہمی پر مبنی ہیں جو ان دنوں سلطنت اسلام کے طول و عرض میں عمل کر رہی تھیں۔ میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہے' ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے' اور ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس نمونہ کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیش نظر رکھیں۔

اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ ہماری قومی ہستی کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہ آئے تو ہمیں ایک ایسا اسلوبِ سیرت تیار کرنا چاہئے جو اپنی خصوصیاتِ مختصہ سے کسی صورت میں بھی علیحدگی نہ اختیار کرے اور خُذ ما صَفا و دَعْ ما کَدَر کے زریں اصول کو پیش نظر رکھ کر دوسرے اسالیب کی خوبیوں کو اخذ کرتے ہوئے ان تمام عناصر کی آمیزش سے اپنے وجود کو کمال احتیاط کے ساتھ پاک کر دے جو اس کی روایت مسلمہ و قوانین منضبطہ کے منافی ہوں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی عُمرانی رفتار کو نگاہ غور سے دیکھنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے جو قوم کے اخلاقی تجربہ کے مختلف خطوط کا نقطۂ اتصال ہے...... ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں بوجوہ اس خفیف سے اختلاف کے جو وہاں کے عقلی حوالی میں ساری و دائر ہے' اس اسلوبِ سیرت کی ضرورت کا اعلان ایک شاعر کی زبردست تخیل نے بلند آہنگی کے ساتھ کیا ہے۔ جناب مولانا اکبر الٰہ آبادی جنہیں موزوں طور پر لسان العصر کا خطاب دیا گیا ہے اپنے بذلہ سنجانہ پیرایہ میں ان قوّتوں کی ماہیت کے احساس کو چھپائے ہوئے ہیں جو آج کل مسلمانوں پر اپنا عمل کر رہی ہیں۔ ان کے کلام کے ظریفانہ لہجہ پر نہ جائیے۔ ان کے شاب آور قہقہے ان کے آنسوؤں کے

پردہ دار ہیں۔ وہ اپنے نہان خانۂ صنعت میں اس وقت تک آپ کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے جب تک کہ آپ ان کا مال خریدنے کے لئے ذوقِ سلیم کے دام اپنی جیب میں ڈال کر نہ آئیں۔ غرض اس جماعت میں جس کے اجزائے ترکیبی کی نوعیت واحد ہو' خیالات و جذبات کا تعلق یہاں تک گہرا ہوتا ہے کہ اگر اس جماعت کے ایک حصّہ کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے تو اس خواہش کے برلانے کا سامان یک بیک دوسرا حصّہ پیدا کر دیتا ہے۔

اب مَیں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں۔ اس وقت تک جو بحث مَیں نے کی ہے اس میں ذیل کی تین حقیقتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے:

۱) مذہبی خیال اسلامی جماعت کا سرچشمۂ زندگانی ہے۔ اس جماعت کی صحت و توانائی کے قائم رکھنے کے لئے ان مخالف قوتوں کی نشو ونما کو جو اس کے اندر کام کر رہی ہیں' بغور دیکھتے رہنا چاہئے اور خارجی عناصر کی سریع آمیزش سے اوّل تو بچانا اور یا اگر آمیزش منظور ہی ہو تو اس امر کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ یہ آمیزش آہستہ آہستہ اور بتدریج ہو تا کہ نظام مدنی کی قوّت آخذہ و جاذبہ پر زیادہ زور نہ پڑے اور اس طور پر یہ نظام بالکل ہی درہم و برہم نہ ہو جائے۔

۲) جماعت اسلامی سے جس فرد کو تعلق ہو اس کا ذہنی سرمایہ اس دولت سے ماخوذ ہونا چاہئے جو اس کے آباء و اجداد کی دماغی قابلیتوں کا ماحصل ہے تا کہ وہ ماضی و استقبال کے ساتھ حال کے ربط و تسلسل کو محسوس کرتا رہے۔

۳) اس کے خصائل و شمائل اس خاص اسلوب سیرت کے مطابق ہوں جس کو میں نے اسلامی اسلوب سے تعبیر کیا ہے۔

اب مَیں تمدن کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کے قومی کارناموں کی قدر و قیمت کا جائزہ لیتا ہوں۔ اسلامی دنیا نے جہانبانی' مذہب' ادب' حکمت' درس و تدریس' وقائع نگاری' صنعت و حرفت اور تجارت کی اصناف میں جو جو کام کیا ہے اس کی مبسوط تنقید کئی ضخیم جلدوں کی محتاج ہو گی۔ عالم اسلام میں جو واقعات اس وقت پیش آ رہے

ہیں وہ نہایت ہی معنی خیز ہیں اور ان پر تفحص کی نگاہ ڈالنا بہت کچھ سبق آموز ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کام بے حد محنت طلب ہے اور میں اس کی انجام دہی سے قاصر ہوں۔ اس لئے میرا تبصرہ فقط مسلمانانِ ہند کے کارناموں سے متعلق ہوگا۔ اگر چہ اس موضوع پر بھی ان مختلف مسائل کی نسبت جو ہمیں درپیش ہیں، میں شرح و بسط کے ساتھ رائے زنی نہ کر سکوں گا۔ میں صرف دو امور سے بحث کروں گا (۱) تعلیم اور (۲) عامّہ خلائق کی عام حالت کی اصلاح۔

گزشتہ پچاس سال کے دوران میں مسئلۂ تعلیم ہماری ہمتوں اور سرگرمیوں کا نصب العین بنا رہا ہے۔ یہ سوال کرنا بے جا نہ ہوگا کہ آیا اشاعتِ تعلیم میں ہم نے کسی خاص غایت کو پیش نظر رکھا ہے یا استقبال کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو کر محض حال کی فوری اغراض کا لحاظ کیا ہے؟ ہم نے کس قسم کے تعلیم یافتہ اشخاص تیار کئے ہیں؟ آیا ان اشخاص کی قابلیت ایسی ہے کہ ہم مسلمانوں کی سی مختص الترکیب جماعت کی عمرانی ہستی کے تسلسل کی کفیل ہو سکے؟ ان سوالات کے جوابات کنایتاً پہلے ہی دیئے جا چکے ہیں۔ علم النفس کے اصول سے جو لوگ واقف ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ نفس ناطقہ کی وہ کیفیت جسے استبصار یا ہشیاری سے تعبیر کرتے ہیں، ذہنی حالتوں کے باقاعدہ تواتر پر منحصر ہوتی ہے۔ جب نفس ناطقہ کے سلسلۂ ہشیاری میں خلل واقع ہو جاتا ہے تو نفس بیمار پڑ جاتا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ قوائے حیوانی رفتہ رفتہ تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہی حالت اقوام کے نفس ناطقہ کی ہے جس کا تسلسل اس اجتماعی تجربے کے باقاعدہ انتقال پر ہے جو نسلاً بعد نسلٍ قوم کو اپنے اسلاف سے میراث میں پہنچتا رہتا ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اس توارثِ متوالیہ کی مؤید ہو کر نفس ناطقہ قومی کو استبصار کا اہل بنائے تا کہ وہ اپنی ذات کے ادراک پر قادر ہو سکے۔ فرد کا رابطہ اتحاد اس قوم کے ساتھ جس کا وہ جزو ہے، اگر بڑھ سکتا ہے تو اسی دانستہ کوشش سے۔ تعلیم کے ذریعہ سے روایات مجتمعہ کے جو مختلف اجزاء اس طور پر منتقل کئے جاتے ہیں وہ نفس ناطقہ قومی میں جذب اور پیوست ہو کر ان چند افراد قوم کے لئے میل و فرسنگ کا کام دیتے ہیں جن کی پوری زندگی اور کل

قابلیت غور و فکر قوم کے مختلف غایات و مقاصد کی منزلیں طے کرنے میں گزر جاتی ہے۔
مثلاً ایک قوم کی قانونی، تاریخی اور علمی روایات اس قوم کے مقنّنوں، مؤرخوں اور انشا
پردازوں کی چشمِ بصیرت کے سامنے ہر وقت ایک نمایاں شکل میں موجود رہتی ہیں،
اگرچہ قوم کی مجموعی حیثیت سے ان روایات کا ادراک موہوم و مبہم طور پر ہوتا ہے۔

اس نقطۂ خیال سے اگر ہم اپنے تعلیمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں تو
معلوم ہوگا کہ موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک
بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا
پردہ نہیں ہے۔ حالانکہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان
بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دُنیوی تعلیم نے
اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولان گاہ بنا ہوا
ہے اور میں علیٰ رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے پیرایہ سے عاری ہو کر اور
مغربی لٹریچر کے نشہ میں ہر وقت سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی
مرکزِ ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے۔ بلاخوفِ تردید میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم
نے ایسی اعلیٰ اور قابل تقلید مثالیں اپنے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے۔
لیکن بایں ہمہ ہمارے نوجوان کو جو اپنی قوم کے سوانحِ عُمری سے بالکل نابلد ہے، مغربی
تاریخ کے مشاہیر سے استحساناً و استشہاداً رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عقلی وادراکی لحاظ سے وہ
مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خودداری کے عنصر
سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے
اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف تجربہ آج ہم سے کرا رہا ہے نظ
نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت احدے اپنا ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گو
اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کہ
دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔ کسی اسلا
مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبر سے زیادہ واضح طور پر بیان نہیں کیا جو نئی نسل۔

مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظر غائر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجہ میں پکار اٹھتے ہیں:

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخ مرحوم کنایہ ہے ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے اس قدامت انتساب نام لیوا سے جو مغربی تعلیم کے بارہ میں سر سید احمد خاں مرحوم کے ساتھ مدت العمر لڑا جھگڑا کیا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہ تھا۔ کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ شیخ مرحوم کے قول میں جو سچائی کا شائبہ مضمر ہے اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کڑوی کسیلی باتوں کے سننے والے مجھے معاف فرمائیں گے۔ آج کل کی طالب العلمانہ زندگی سے چونکہ گزشتہ دس بارہ سال کی مدت میں مجھے سابقہ پڑتا رہا ہے اور میں ایک ایسے مضمون کا درس دیتا رہا ہوں جس کو مذہب سے قریب کا تعلق ہے' لہٰذا میں اس بات کا تھوڑا بہت استحقاق رکھتا ہوں کہ میری باتیں سنی جائیں۔ مجھے رہ رہ کر یہ رنج دہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب العلم جو اپنی قوم کے عُمرانی' اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے' روحانی طور پر بمنزلہ ایک بے جان لاش کے ہے اور اگر موجودہ صورت حالات اور بیس سال تک قائم رہی تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علَم برداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے' ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔ وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچے کی تعلیم کا آغاز کلامِ مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیئے وہ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی ماہیت ونوعیت سے زیادہ باخبر تھے۔

ہماری قومی سرگرمیوں کی محرک اقتصادی اغراض ہی نہیں ہونی چاہئیں۔ قوم کی وحدت کی بقا اور اس کی زندگی کا تسلسل قومی آرزوؤں کا ایک ایسا نصب العین ہے جو فوری اغراض کی تکمیل کے مقابلہ میں بہت زیادہ اشرف و اعلیٰ ہے۔ ایک قلیل البضاعت مسلمان جو پہلو میں ایک درد بھرا اسلامی دل رکھتا ہو میری رائے میں قوم کے

لئے بمقابلہ اس بیش قرار تنخواہ پانے والے آزاد خیال گریجوایٹ کے زیادہ سرمایۂ نازش ہے جس کی نظروں میں اسلام اصولِ زندگی نہیں بلکہ محض ایک آلۂ جلب منفعت ہے جس کے ذریعہ سے بڑے بڑے سرکاری عہدے زیادہ تعداد میں حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ میری ان باتوں سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ میں مغربی تہذیب کا مخالف ہوں۔ اسلامی تاریخ کے ہر مبصر کو لامحالہ اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہمارے عقلی و ادراکی گہوارے کو جھلانے کی خدمت مغرب ہی نے انجام دی ہے۔ فلسفیانہ تخیل کی سرزمین میں ہم شاید ابھی تک بجائے عربی یا ایرانی ہونے کے زیادہ تر یونانی نظر آ رہے ہیں۔ بایں ہمہ اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ خود ہماری خالص اسلامی تہذیب اپنی مثال آپ ہے اور تعلیم کا کوئی جدید اسلامی نظام متعلمین کی قومیت پر حرف لائے بغیر اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسلامی یونیورسٹی کے خیال کا ہمارے دل میں پیدا ہونا حقیقت میں ہماری قومی ہستی کے حق میں ایک مبارک علامت ہے۔ جب ہم اپنی قوم کی نوعیت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس قسم کے دارالعلم کی ضرورت میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی بشرطیکہ یہ دارالعلم ٹھیٹھ اسلامی اصول پر چلایا جائے۔ کوئی قوم اس رشتہ کو یک بیک نہیں توڑ سکتی جو اسے اس کے ایام گزشتہ سے جوڑے ہوئے ہے' اور مسلمانوں کے لئے تو اس تعلق کو چھوڑ دینا اور بھی محال ہے جن کی مجموعی روایات ان کی قومیت کی جان ہیں۔ مسلمان کو بے شک علومِ جدیدہ کی تیز پا رفتار کے قدم بقدم چلنا چاہئے' لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو جسے ہم اپنی قومی تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں۔ ہم کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اُٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو اسلام کے آبِ حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں پکے مسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں' بلکہ ایک ایسا نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں جو بوجہ کسی اکتنازی یا اتحادی مرکز کے نہ ہونے کے اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا اور گرد و پیش کی ان قوموں میں سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائے گا جس میں اس کی بہ

نسبت زیادہ قوت و جان ہوگی۔

لیکن ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہونا ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے۔کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علماء اور واعظ انجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں' اس لئے کہ ان کا مبلغِ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے۔اَخلاق اور مذہب کے اصول و فروع کی تلقین کے لئے موجودہ زمانہ کے واعظ کو تاریخ' اقتصادیات اور عُمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہئے۔الندوہ' علی گڑھ کالج' مدرسہ دیوبند اور اسی قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں' اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں کر سکتے۔ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اَغراض کا مرکزی دارالعلم ہونا چاہئے جہاں افرادِ قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشو و نما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار کیا جا سکے جس میں زمانہ موجودہ کے ہندوستانی مسلمان کو ڈھلنا چاہئے۔پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دارالعلم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دلکش انداز سے ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویر مثالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔اس کے لئے اعلیٰ تخیل' زمانہ کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے۔

اس بحث کے خاتمہ سے پہلے مَیں مسلمان عورتوں کی تعلیم کے متعلق چند کلمات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔اسلام میں عورتوں کا جو درجہ ہے اس پر تفصیلی رائے زنی کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔البتہ کھلے کھلے لفظوں میں اس امر کا اعتراف میں ضرور کروں گا کہ بجوائے آیہ کریمہ ﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ میں مرد اور عورت کی مساواتِ مطلق کا حامی نہیں ہو سکتا۔یہ ظاہر ہے کہ قدرت نے ان دونوں کے تفویض جدا جدا خدمتیں کی ہیں اور ان فرائض جداگانہ کی صحیح اور باقاعدہ انجام دہی خانوادۂ انسانی کی

صحت اور فلاح کے لئے لازمی ہے۔ مغربی دنیا میں جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے، عورتوں کا آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہو گا اور نظامِ معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی۔ اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم سے بھی جس حد تک افرادِ قوم کی شرح ولادت کو تعلق ہے جو نتائج مترتب ہوں گے وہ بھی غالباً پسندیدہ نہ ہوں گے۔ مغربی دنیا میں جب عورتوں نے گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر کسب معاش کی جدوجہد میں مردوں کا ساتھ دینا شروع کیا تو خیال یہ کیا جاتا تھا کہ ان کی یہ اقتصادی حریت دولت کی پیداوار میں معتد بہ اضافہ کرے گی۔ لیکن تجربہ نے اس خیال کی نفی کر دی اور ثابت کر دیا کہ اس خاندانی وحدت کے رشتہ کو جو بنی نوع انسان کی روحانی زندگی کا جزوِ اعظم ہے، یہ حریت توڑ دیتی ہے۔

میں اس حقیقت کے اعتراف کے لئے آمادہ ہوں کہ زمانۂ حال میں کسی جماعت کا محض مقامی قوتوں کے ذریعہ سے نشو ونما پانا محال ہے۔ ریل اور تار نے زمان ومکان کے پردہ کو درمیان سے اٹھا سا دیا ہے اور دُنیا کی مختلف قومیں جن میں پہلے بُعد المشرقین حائل تھا اب پہلو بہ پہلو بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس ہم نشینی کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ بعض قوموں کی تو حالت بدل کر رہ جائے گی اور بعض قومیں بالکل ہی ملیامیٹ ہو جائیں گی۔ جو عظیم الشان اقتصادی، عُمرانی اور سیاسی قوتیں اس وقت دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں ان کے نتائج کے بارہ میں کوئی شخص پیش بندی کی راہ سے رائے زنی نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ گو کسی قوم کے لئے بغرضِ تکمیلِ صحت اپنی تمدنی آب وہوا کی تبدیلی کے طور پر کسی غیر قوم کے تمدن کے عناصر کا اخذ وجذب کرنا قرین مصلحت بلکہ لازمی ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر اغیار کی تقلید میں شتاب زدگی اور بے سلیقگی سے کام لیا گیا تو نظام قومی کے اعضاءِ رئیسہ میں اختلالِ عظیم کے پیدا ہونے کا خطرہ ہو گا۔ اقوام کے تمدن میں ایک پہلو عمومیت کا ہوا کرتا ہے لیکن ان کی معاشرت کی رسموں

اور سیاسی دستوروں میں خصوصیتِ شخصی کی شان نظر آتی ہے۔ یہ رسوم اور یہ دستورات ان قوموں کی تاریخی زندگی اور ان کی خاص روایات سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ پس اپنی قوم کی خاص نوعیت' اسلام کی تعلیم اور عالم نسواں کے متعلق علم الاعضاء وعلم الحیات کے اکتشافات کو مدنظر رکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسلمان عورت کو جماعت اسلامی میں بدستور اسی حد کے اندر رہنا چاہئے جو اسلام نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے اور جو حد کہ اس کے لئے مقرر کی گئی ہے اسی کے لحاظ سے اس کی تعلیم ہونی چاہئے۔

میں نے سطورِ بالا میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہماری جماعت کا شیرازہ اُسی وقت تک بندھا رہ سکتا ہے جب تک کہ مذہب اسلام اور تہذیب اسلام کو ہم پر قابو ہے۔ چونکہ عورت کے دل و دماغ کو مذہبی تخیل کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے لہٰذا قومی ہستی کی مسلسل بقا کے لئے یہ بات نہایت ہی ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتدا میں ٹھیٹھ مذہبی تعلیم دیں۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو ان کو اسلامی تاریخ' علم تدبیر خانہ داری اور علمِ اصولِ حفظِ صحت پڑھایا جائے۔ اس سے ان کی دماغی قابلیتیں اس حد تک نشو و نما پا جائیں گی کہ وہ اپنے شوہروں سے تبادلہ خیالات کر سکیں گی اور امومت کے وہ فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں گی جو میری رائے میں عورت کے اوّلین فرائض ہیں۔ تمام وہ مضامین جو ان کی نسائیت کی نفی کرنے یا اسلام کی حلقہ بگوشی سے انہیں آزاد کرنے والے ہوں باحتیاط ان کے نصاب تعلیم سے خارج کر دینے چاہئیں۔ لیکن ہمارے نکتہ آموز ابھی تک اندھیرے میں رستہ ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک ہماری لڑکیوں کے لئے کوئی خاص نصابِ تعلیم معین ومرتب نہیں کیا اور ان میں سے بعض بزرگواروں کی آنکھیں تو مغربی تصورات کی روشنی سے ایسی چندھیا گئی ہیں کہ وہ ابھی تک اسلام میں جو قومیت کو ایک خاص ذہنی کیفیت یعنی مذہب پر منحصر قرار دیتا ہے اور مغربیت میں جس نے قومیت کا محل ایک خارجی مواد یعنی وطن کی بنیاد پر تعمیر کیا ہے کوئی فرق نہیں سمجھ سکے۔

اب میں چند خیالات اپنی قوم کے غرباء کی عام حالت کی اصلاح کے متعلق ظاہر

کرتا ہوں۔ اس ضمن میں عام طبقہ کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت سب سے پہلے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوس ناک اور قابل رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزوِ غالب مسلمان ہیں، معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اجرت، غلیظ مکان اور اس کے پیٹ بھر روٹی کو ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا؟ لاہور کے کسی اسلامی محلّہ میں جا نکلو۔ ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں کی چیخ و پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقعہ میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صدہا مَرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے، لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک مُنہ میں اڑ کر نہیں گیا لیکن غیرت اور خود داری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پساریں۔ ہمارے نوجوان عَلَم بردارانِ اصلاحِ تمدّن جو پردہ کی رسم کو ہماری قوم کے قویٰ کے روز افزوں انحطاط کا باعث قرار دینے کے عادی ہیں، شاید یہ نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصلی ذمہ دار پردہ نہیں بلکہ یہ جان فرسا افلاس ہے جو ہماری قوم کے ادانی و اقاصی کو کھائے جا رہا ہے۔ علاوہ اس افلاس زدہ طبقہ کے ایک اور طبقہ ان نکمے اور نکھٹو افراد کا ہے جو اپنے جیسی ناکارہ اولاد پیدا کر کے سستی و کاہلی اور بداعمالی و سیہ کرداری کی زندگی خود بھی بسر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنا سا بنا دیتے ہیں۔ کیا ہم نے تمدنی عقدہ کے ان پہلوؤں پر بھی کبھی نظر ڈالی ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ہماری انجمنوں اور مجلسوں کا فرض یہ نہیں ہے کہ خاص خاص اشخاص کی کلاہ اعزاز و افتخار میں بیٹھے ہوئے طرّے لگایا کریں بلکہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی سطح کو اونچا کریں؟ سب سے زیادہ اہم عقدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے، یہ ہے کہ کیونکر اپنی قوم کی

اقتصادی حالت کو سدھارے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ ہندوستان کی عام اقتصادی حالت پر نظر غائر ڈال کر ان اسباب کا پتہ چلائے جنہوں نے ملک کی یہ حالت کر دی ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی اس حالت میں کس حد تک ان بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصہ لیا ہے جو آج کل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں؟ کس حد تک اہل ملک کی تاریخی روایات، عاداتِ اوہام اور اخلاقی کمزوریوں نے حصہ لیا؟ اور اگر گورنمنٹ کے طرزِ عمل کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے تو وہ کس حد تک ہے؟ جو شخص اس گتھی کو سلجھانے کا بیڑا اٹھائے اسے چاہئے کہ مذہب و ملت کے اختلاف کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو جائے اور کسی ایک جماعت کی طرف داری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے۔ اس لئے کہ اقتصادی قوتیں تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں۔ شرح مال گزاری کا آئے دن اضافہ، مسکراتِ ممالک غیر کی اس ملک میں درآمد، قیمت اجناس کی گرانی (خواہ اس گرانی کا باعث یہ ہو کہ سکّہ رائج الوقت کے متعلق حکومت کے قائم کئے ہوئے اصول غلط ہیں یا یہ ہو کہ ایک زراعتی ملک اور ایک صنعتی ملک کے درمیان آزاد تجارت کا سلسلہ قائم کر دیا گیا ہے، یا کوئی اور سبب ہو) یہ تمام امور ایسے ہیں جو مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور پارسیوں کی اقتصادی حالت پر یکساں مؤثر ہو کر نہایت بلند آہنگی سے منادی کر رہے ہیں کہ مختلف جماعتوں کے اہل الرائے اور مقتداء اگر اور باتوں میں نہیں تو اقتصادیات میں تو ضرور آپس میں سر جوڑ کر مشورہ کر سکتے ہیں اور ملک کی مشترکہ فلاح کی تدابیر پر غور کر سکتے ہیں۔ لیکن مسلمان پیشوایانِ قوم نے اب تک اپنی تمام توجہ اس مسئلہ پر صرف کئے رکھی ہے کہ سرکاری نوکریاں ہم لوگوں کو بہ حصہ رسدی ملتی رہیں۔ یہ کوشش بجائے خود ضرور قابل ستائش ہے اور تاوقتیکہ مسلمانوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو، ہمارے سربرآوردگان ملت کو برابر اس کوشش میں سرگرمی کے ساتھ مصروف رہنا چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی انہیں مدنظر رکھنی چاہئے کہ دولت کی پیداوار کا ذریعہ ہونے کے لحاظ سے سرکاری ملازمت ایک نہایت ہی محدود ذریعہ

ہے۔ سرکاری ملازمت معدودے چند اشخاص کو ضرور آسودہ وخوشحال بنا دیتی ہے لیکن قوم کے تمام افراد اسی صورت میں آسودہ وخوشحال ہو سکتے ہیں جب کہ ان کو اقتصادی آزادی نصیب ہو۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اگر کسی قوم کے چند افراد حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوں تو اس قوم کی عزت اور خودداری میں چار چاند لگ جاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ اقتصادی سرگرمی کے اور بہت سے اصناف ایسے ہیں جو اہمیت اور سودمندی میں سرکاری ملازمت کے لگ بھگ ہیں۔ جس قوم کو اپنے اسلاف سے سپاہیانہ روایات ترکہ میں پہنچی ہوں اس کے لئے سپہ گری کے تصورات کو چھوڑ کر تجارت اور صنعت وحرفت کی ڈگر پر پڑ لینا یقیناً تکلیف دہ ہے۔ لیکن چونکہ مغربی اقوام کی دیکھا دیکھی ایشیا کی تمام قوموں کی اقتصادی حالت تغیّر پذیر ہوتی جاتی ہے لہٰذا یہ کودوں تو دَلنی ہی پڑے گی۔ علاوہ اُن اقتصادی مشکلات کے رفع کرنے کے جو ہماری سنگ راہ ہیں ہمیں صنعتی تعلیم پر بھی ضرور اپنی توجہ صرف کرنی چاہئے جو میری رائے میں اعلیٰ تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ صنعتی تعلیم سے عامہ خلائق کی اقتصادی حالت سدھرتی ہے اور یہی طبقہ قوم کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے۔ بخلاف اس کے اعلیٰ تعلیم صرف ان چند افراد کو نفع پہنچاتی ہے جن کی دماغی قابلیت درجۂ اوسط سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ ہمارے اغنیاء کے بذل وجود کا مصرف ایسا ہونا چاہئے کہ عام مسلمانوں کے بچے ارزاں صنعتی تعلیم حاصل کر سکیں۔ لیکن صنعتی اور تجارتی تعلیم بلا کسی اضافی تربیت کے بجائے خود کافی و مکتفی نہیں ہے۔ اقتصادی مقابلہ میں تربیت کے اَخلاقی عناصر کی کچھ کم ضرورت نہیں پڑتی۔ اعتماد باہمی، دیانت داری، پابندیٔ اوقات اور تعاون وہ اقتصادی اوصاف ہیں جو مہارت فن کی برابر کی جوڑ ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے کارخانے محض اس لئے نہ چل سکے کہ کارخانہ داروں کو نہ ایک دوسرے پر بھروسہ تھا اور نہ اصولِ امداد باہمی ان کا رہ نما تھا۔ اگر ہم اچھے کاریگر، اچھے دکاندار، اچھے اہل حرفہ اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) اچھے شہری پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ انہیں اوّل پکا مسلمان بنائیں۔

فرہنگ

اجزائے لاینفک: اٹوٹ انگ
ادراک: فہم، عقل
اژدھام خلائق: لوگوں کا ہجوم
استبصار: طلب بصیرت
اکتشاف: کسی نئی حقیقت کی دریافت
اکتناز: اتصال، ملنا
﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ (النساء:۳۴)
''مرد عورتوں کے سربراہ اور کارفرما ہیں''۔
ادانی و اقاصی: عام و خاص
بدیہی: ظاہر، واضح، یقینی
بذل وجود: سخاوت، صدقہ خیرات
بصارتِ شبینہ: رات کے اندھیرے میں دیکھنے کی جبلی صلاحیت
بُعد المشرقین: دونوں مشرقوں کا فاصلہ۔ بے حد فاصلہ
بلا انقطاع: بغیر منقطع ہوئے۔ تسلسل ٹوٹے بغیر
بلا مشارکت احدے: کسی کی شراکت کے بغیر
تالیہ: تابع
تقشّف: پرہیزگاری، متانت، سنجیدگی
تنزیہی: تجسیمی کے برعکس، مادی آلائش سے پاک
توارثِ متوالیہ: وراثت کا تسلسل
تولید: پیدائش
جلبِ منفعت: فائدہ یا نفع حاصل کرنا
جلی: ظاہر، روشن
جہد للبقا: زندہ اور قائم رہنے کی کوشش
حاسہ: احساس، محسوس کرنے کی صلاحیت
خبیر: خبر رکھنے والا، اللہ کا اسم صفاتی
خذ ما صفا ودع ما کدر: اچھی چیز لے لینا، بری چیز چھوڑ دینا
خردہ گیری کرنا: نکتہ چینی کرنا
خفی: پوشیدہ

ساری و دائر: جاری و ساری
سریع آمیزش: تیزی سے ملانا
سقیم الحال: بدحال، ناتواں
شرح و بسط: صراحت و تفصیل سے
شمائل مختصہ: خاص وضع و خصلتیں
صحیح القوام: درست مرکب
طاغی: باغی، سرکش
طاقت گریز: خطرناک موقع سے بچ نکلنے کی جبلی صلاحیت
علیٰ رؤس الاشہاد: سب کے سامنے، علانیہ، جس کے لئے کسی تائیدی شہادت کی ضرورت نہ ہو
عُمرانیات: معاشریات، سوشیالوجی
غایت: غرض، مطلب، انتہا، انجام
غایت الغایات: اغراض کی بنیاد
غلو: از حد مبالغہ، محال عقل و مشاہدہ
غیر مختتم: ختم نہ ہونے والی
فوق الادراک: عقل و فہم سے بالاتر
قوت آخذہ و جاذبہ: اخذ کرنے اور جذب کرنے کی صلاحیت یا طاقت
قوتِ شامہ: پیش آمدہ خطرے کو سونگھنے کی جبلی صلاحیت
کودوں دَلنا: سخت کام کرنا
کنہ: حقیقت، ماہیت، بات کی تہہ
ماند و بود: رہنا سہنا (طرز یا طریقہ کے ساتھ)
مبرّا: بری، پاک
مدار علیہ: جائے گردش، دائرہ، کسی کام پر انحصار
معرّا: خالی
معہود فی الذہن: ذہن میں عہد کیا ہوا، ذہنی سمجھوتہ
مقنن: قانون دان، فقیہہ

اسلامی معاشرت

’’آزادیٔ نسواں‘‘ کی صدائے بازگشت

تحریر: محمد آصف احسان عبدالباقی

اسلام کے واضح و بیّن احکامات اپنے اندر انسان کی دُنیوی و اُخروی فوز و فلاح اور ترقی و کامیابی کے اَن گنت پہلو سموئے ہوئے ہیں جن کے فوائد و ثمرات کا مکمل احاطہ انسانی استعداد سے ماوراء ہے۔ اس عاجزی و کم ہمتی کے باوجود مسلمان اسلامی تعلیمات کی ادائیگی و تعمیل کے پابند کئے گئے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے گئے احکام کی بجا آوری اور انجام دہی (performance) کے مکلّف ہیں' باوجودیکہ ان کی حکمت و منطق ان کے فہم و ادراک سے بعید و بالاتر ہو۔ یہ ایک بنیادی قاعدہ ہے' وگرنہ احکاماتِ اسلامیہ کے اوامر و نواہی میں مضمر و پوشیدہ کثیر فوائد انسانی علم میں آ چکے ہیں اور ہم بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں کہ ایک اسلامی و فلاحی معاشرے کی حقیقی تشکیل اور تعمیر و ترقی میں وہ کس قدر دُوررس نتائج کے حامل ہیں۔

مسلمانوں کو صدرِ اسلام ہی سے گوناگوں مسائل اور فتنوں کا سامنا ہے جن کے اسباب و علل اور محرکات میں یہود و نصاریٰ کی پرفریب اور کشش انگیز چالوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ ’’مَغضُوب عَلَیھِمْ‘‘ اور ’’الضَّالِّیْنَ‘‘ کی مصداق ان دونوں اقوام نے مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور اپنے مابین بے شمار مذہبی عقائد و معاملات کے اختلافات کے باوجود مسلم اُمہ کے مقابلے میں یہ ہمیشہ یکجا و متفق رہے ہیں۔ مسلمانوں کو سرنگوں کرنے اور نیچا دکھانے کے لئے یہ اپنے تمام مکائد و دسائس کے ساتھ جملہ وسائل کو بروئے کار لاتے ہیں جس میں من حیث المجموع عالم کفر کی دیگر اقوام بھی ان کے شانہ بشانہ ہوتی ہیں۔ عالم اسلام کی اسلامی افکار و نظریات کی تنفیذ کے متعلق اجتماعی بے حسی اس سیل

تباہ کن کے آگے بند باندھنے کی بجائے ان کی باطل و گمراہ کن (fallacious) تعلیمات کی اشاعت کو نت نئے مواقع فراہم کر رہی ہے جو ایک دردناک حقیقت اور المناک واقعہ ہے۔

مغربی تہذیب کے انہی چیلنجوں اور تحدیات میں سے ایک عظیم معاشرتی برائی اسلامی ممالک میں عریانی و فحاشی کا اعلانیہ فروغ ہے۔ اسلام جو کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ کے علاوہ مکمل ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی سے متعلقہ جملہ احکام مسلمانوں کو دیتا ہے، اہل اسلام کے اس عملی و فکری انحطاط و پستی پر محو حیرت ہے، ان پر جن کے ذمہ پوری انسانیت کی قیادت و راہنمائی تھی، ان پر جو کہ محمد عربی ﷺ کے پیغامِ برحق کے امین تھے، آج اپنے دینی تشخص و وجود کو کھو چکے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے متنوع استعماری و استبدادی ہتھکنڈے بلاشک و شبہ ہماری تہذیب و ثقافت پر اثر انداز ہو چکے ہیں۔ جھوٹی جدت و ترقی کی تلاش میں یورپ و امریکہ کی معاشرت کی پس روی اور تقلید نے ہمیں دین اسلام کے تابندہ و درخشندہ نظامِ معاشرت سے کوسوں دُور پھینک دیا ہے۔ محل استعجاب ہے کہ اس مادر پدر آزادی اور رند مشرب اعمال و افعال کے مہلک اثرات سے آگاہ ہونے کے باوجود ہم اسے اجتماعی سطح تک اختیار کئے ہوئے ہیں۔ دیگر اسلامی ممالک میں موجود اخلاقی و معاشرتی پستی کے بیان سے قطع نظر، وطن مالوف ہی میں غیرتِ اسلامی اور حیاء سے عاری افکار کی ترویج و اشاعت اور حکومتی سطح پر ان کی سرپرستی و تائید ایک المیہ ہے۔ اس پر مستزاد دینی و مذہبی حلقوں کا اس پر سکوت اور اس کی عملی مخالفت و مزاحمت سے پہلو تہی ایک خوفناک طوفان کا پیش خیمہ ہے جو صرف بدکاروں ہی کو نہیں بلکہ دیگر لوگوں کو بھی خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔

ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝﴾ (الانفال: ٢٥)

''اور اُس فتنے سے ڈرو جو خصوصیت کے ساتھ انہی لوگوں پر واقع نہیں ہو گا جو تم

میں گناہگار ہیں' اور جان رکھو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔''

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝﴾ (النور: ۱۹)

''جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مؤمنوں میں بے حیائی پھیلے ان کو دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہوگا' اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔

انسانی زندگی کے مختلف و متنوع نظاموں میں خاندانی نظام کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بنی نوع انسان کی بقاء کا دارو مدار مرد و زن کے باہمی تعاون و اشتراک پر منحصر ہے اور بلا شک و شبہ کسی بھی سوسائٹی کی ترقی و کامیابی پر خاندانی نظام کے اچھے یا بُرے اثرات ضرور مترتب ہوتے ہیں۔ اگر اس خاندانی نظام سے صالح افراد جنم لیں گے تو معاشرہ بھی نیکی و بھلائی اور امن و آشتی کا گہوارہ ہوگا اور اگر اسی میں خرابی ہوئی تو اس سے ترتیب پانے والی لوگوں کی تنظیم سے اصلاحی و فلاحی امور کی توقع رکھنا عبث ہے۔ یہی سوچ جو سراسر حقیقت پر مبنی ہے' اسلام ہمارے اذہان میں پیدا کرنا چاہتا ہے اور اسی کی خرابی کے لئے سعی و جدو جہد کرنے پر اللہ نے شدید عذاب کی وعید سنائی ہے۔

انسان کا زندگی میں جن مسائل سے سابقہ پڑتا ہے اسلام نے ان کا شفّاف اور واضح (transparent and distinct) حل حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے جس کی بہترین مثال تمام مسلمانوں کو ایک جسم کی مانند قرار دینا ہے۔ جیسے جسم کے کسی ایک عضو میں تکلیف ہو تو سارا بدن اسے محسوس کرتا ہے بالکل اسی طرح مسلمان بھی ہیں جو ایک دوسرے کے دکھ درد کو اپنی تکلیف و پریشانی سمجھتے ہیں' جو مشکل اوقات اور فلاکت و نکبت کے ادوار میں بجائے قطع تعلق کرنے کے ایک دوسرے کے غم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں اور اسی اتحاد و اتفاق کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آنے والے معاشرے میں ہر شخص کی جان' مال اور عزت و عصمت وغیرہ محفوظ رہتی ہے' جس

کا اصل محرک محبت ومودت کا جذبۂ بے مثال ہے۔ اسی طریقے سے اسلام ایک مسلمان کی راہنمائی کرتا ہے کہ اگر وہ کسی نامحرم عورت کو بری نگاہ سے دیکھے گا تو اسے یہ بات از بر رہنی چاہیئے کہ خود اس کی ماں، بہن اور بیٹی کے ساتھ بھی یہ سلوک ہوسکتا ہے۔

مَردوں کے عورتوں کی جانب فطری وجبلّی میلان کے باعث موجودہ فحاشی کی اشاعت میں عورت ہی کا زیادہ کردار ہے۔ نبی اقدس ﷺ نے آج سے چودہ سو سال قبل ہی ہمیں اس سے متنبہ فرما دیا تھا۔ چنانچہ حضرت اُسامہ بن زید (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے اپنے بعد کوئی ایسا فتنہ نہیں چھوڑا جو مَردوں کے حق میں عورتوں کے فتنہ سے زیادہ ضرر رساں ہو''۔ (بخاری ومسلم)

نیز ارشاد فرمایا:

''دنیا شیریں اور سرسبز (جاذبِ نظر) ہے اور چونکہ اللہ نے تمہیں اس دنیا کا خلیفہ بنایا ہے اس لئے وہ (ہر وقت) دیکھتا ہے کہ تم اس میں کیا عمل کرتے ہو، لٰہذا دنیا (کے مکر وفریب) سے بچو اور عورتوں کے فتنہ سے بچو، کیونکہ بنو اسرائیل کی تباہی کا باعث سب سے پہلا فتنہ عورت ہی کی صورت میں تھا''۔ (مسلم)

مندرجہ بالا احادیث سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ شاید اسلام میں عورت کی تحقیر کی گئی ہے۔ ایسا نہیں، بلکہ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے عورت کو اس کے صحیح ومقررہ حقوق عطا کئے ہیں۔ اس موضوع پر اہلِ قلم کی مستقل تصانیف وتالیفات موجود ہیں جن میں اسلام کے عورتوں پر کئے جانے والے احسانات وانعامات کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے، جبکہ تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قدیم متمدن معاشروں میں ترقی صرف صنفِ واحد یعنی مَرد کی سعی تک محدود سمجھی جاتی رہی ہے۔ ہندوستان کے قریب ترین مذاہب ہندو دھرم اور بدھ مت وغیرہ میں عورت کو بدی کی جڑ کہا گیا ہے اور اسے نہایت حقیر وذلیل سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں بیوی کے لئے پتنی (کنیز) کے الفاظ اور ''ستی'' ہونے کی رسم اس بات کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔ اس کے علاوہ ترقی وتمدن کے گہوارے یونان میں اسے شیطان سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔ روم،

ایران، چین، مصر اور تہذیب انسانی کے دوسرے مراکز کا حال بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ صدیوں کی محکومی و مظلومی اور عالمگیر حقارت نے خود عورت کے ذہن سے بھی عزتِ نفس کا احساس مٹا دیا تھا۔ وہ خود بھی اس امر کو بھول گئی تھی کہ دنیا میں وہ کوئی حق لے کر پیدا ہوئی ہے یا اس کے لئے بھی عزت کا کوئی مقام ہے۔ یہ ایک تفصیلی موضوع ہے جس کے احاطے کے لئے صفحات کے دفتر درکار ہیں۔ کچھ ذکر برسبیل تذکرہ ہو گیا جس کا مقصد اسلام کے ان بے شمار انعامات کا تذکرہ تھا جو اُس نے عورت پر ماں، بہن، بیٹی اور بیوی وغیرہ کی حیثیت سے کئے ہیں۔

اس اکرام و تفضیل کے باوجود ''آزادئ نسواں'' کے اخلاقی اور انسانی معیار سے گرے ہوئے نعروں کی صدائے بازگشت ایک تعجب خیز امر ہے۔ ان نعروں کے باوجود عورتوں کے ساتھ ایک دوسرے طریق سے فریب کھیلا جا رہا ہے، وہ یوں کہ زندگی اور تمدن کے لئے مَرد و زن کے مابین اشتراک و تعاون مطلوب ہے۔ مغربی تحریکیں بجائے تالیف کے مخاصمت اور تفریق کی تبلیغ کر کے بیگانگی کی خلیج وسیع کر رہی ہیں اور تعاون و تناصر کے بجائے باہمی بیزاری پیدا کی جا رہی ہے، آزادی کے نام پر ان کو بے راہ روی اور مادر پدر آزادی سکھائی جا رہی ہے۔ مغرب کی اندھی تقلید میں مشرقی اور دیگر مسلمان ممالک کو بھی یہی صورت حال درپیش ہے۔ مصر، شام، عراق، ایران، افغانستان اور پاکستان میں بھی آج ان تحریکوں کے مہیب سائے منڈلا رہے ہیں جبکہ ترکی (اگر مبالغے پر محمول نہ کیا جائے تو) اس معاملے میں یورپی ممالک سے بھی آگے گزر گیا ہے۔ اباحیت پسند طبقہ اسلام کو کیا نقصان پہنچائے گا مگر اپنی عاقبت ضرور برباد کر رہا ہے۔

وہ جدت و ترقی جو انسان کو حقیقی و سچی خوشی سے ہمکنار کر دے، ہمیں درکار ہے۔ قابلِ تأسف بات یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید مغربی ممالک اخلاقیات میں جدت کی راہ پر گامزن ہیں، جبکہ ایسا نہیں، اس تزویری جھانسے ہی نے ہمیں قبولِ حق سے روکا ہوا ہے۔ دراصل یہ ننگ انسانیت افعال جدت کے نہیں بلکہ عہدِ عتیق سے بھی بدتر جاہلیت

کے آئینہ دار ہیں جس نے ان لوگوں کو حیوانات اور بہائم کی سطح سے بھی گرا کر تحت الثریٰ کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا ہے۔ یہ محض ظاہری آنکھ ہے جو انہیں انسان کے روپ میں دیکھتی ہے وگرنہ ابتدائے آفرینش ہی سے حیاء اور غیرت کے جذبات انسانی طرۂ امتیاز رہے ہیں جو اسے شکل میں مختلف مگر افعال و اعمال میں مطابق و موافق جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

مغربی تہذیب سکون و اطمینان سے عاری اور کیف و سرور سے خالی ہے۔ حالیہ رپورٹوں کے مطابق یورپ میں شرح طلاق انتہائی حد تک بڑھ چکی ہے۔ اوّل تو وہاں پر نکاح کے مفید اثرات کے تصورات ہی شاذ ہیں اور اگر کچھ ہیں تو ان کا انجام و اختتام بھی اس پر ہوتا ہے کہ جس سے معاشرتی بقاء کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ عموماً طلاق کی وجوہات ایسی ہوتی ہیں جنہیں سن کر ہنسی آتی ہے' مثلاً میاں بیوی میں کسی ایک کا سوتے میں خراٹے لینا یا کتّے کو پسند نہ کرنا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

اوّل تو اسلامی احکامات وتعلیمات کا مکمل نفوذ ہمارے ہر شعبۂ زندگی میں ہونا چاہئے' تاہم بالفرض اگر ہم اسلام کے نظامِ معاشرت یعنی ستر وحجاب سے صرف نظر بھی کریں تو بھی مشرقی روایات و اقدار ہمیں اس آزادی کی اجازت نہیں دیتیں۔ درحقیقت ظاہری و باطنی شرافت ونجابت ہماری سرزمین کی مقدس میراث ہے جس سے اعراض واضراب کم از کم وطن عزیز میں ممنوع ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں مختلف افراد کی مختلف ذمہ داریاں ہیں۔ مردوں پر باپ' خاوند' بھائی اور بیٹے کی حیثیت سے لازم ہے کہ وہ اپنی بیٹی' بیوی' بہن اور ماں کو بے پردگی اور اجنبی مَردوں سے غیر ضروری میل ملاپ کی قطعاً اجازت نہ دیں۔ بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبؔر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا؟
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا!

اسی لئے دانا کہتے ہیں کہ ایک بے پردہ عورت ایک بے غیرت باپ' خاوند' بھائی اور بیٹے کی علامت ہے۔ یہ قریب ترین رشتے ہیں۔ اگر انہی میں سے کوئی بے غیرتی کی انتہا کو پہنچ جائے تو پھر اسے کسی گناہ کے ارتکاب کا کوئی ڈر یا خوف نہیں ہوگا' کیونکہ جب حیاء جیسی متاعِ عزیز ہی رخصت ہو جائے تو پھر ایسا شخص کس اندوختہ پر فخر کرے گا؟

پس عصر حاضر میں مسلمانوں کا فرض عین ہے کہ وہ بقدر استطاعت عریانی و فحاشی کے اس تباہ کن (destructive) ریلے کو روکنے کی جدوجہد کریں اور اس کے محرکات مثلاً کیبل اور انٹرنیٹ وغیرہ جنہیں اس قبیح و شنیع مقصد کی تکمیل کے لئے انتہائی ارزاں (cheap) کر دیا گیا ہے' کی اصلاح کی کوشش کریں۔ مختلف رسائل و جرائد جن میں موجود مواد شہوانی جذبات کو ابھارتا ہے اور جو اخبارات فحش تصاویر کی اشاعت کرتے ہیں' کی فی الفور روک تھام حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے۔ وگرنہ یہ شیریں زہر آہستہ آہستہ ہماری نوجوان نسل کی رگوں میں سرایت کرتا جائے گا جس کا انجام انتہائی گھناؤنا ہوگا!

اللہ تعالیٰ ہمیں ابھی سے سنبھلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

'Science-Religion Dialogue'

Hazara Society of Science-Religion Dialogue is pleased to offer a free gift of its first issue of quraterly journal 'Science-Religion Dialogue' scheduled in the 3rd week of May 2002. Please confirm your copy in advance by registered mail by sending postal stamps (tickets) of Rs.20 or by ordinary mail by sending stamps (tickets) of Rs.10.

Please send your letters to :

Prof. Abdul Majid,
Chairperson,
HSSRD,
V/P.O Mari Khankhel, via Bher kund,
District & Tehsil Mansehra
Hazara, Post Code 21340
Email:amajidpk@yahoo.com
website: www.hssrd.org

خوش خبری : فہمِ قرآن میں اضافے کے لیے فنی کتاب

’قواعدِ زبانِ قرآن‘ کا دوسرا حصہ شائع ہو گیا ہے

صفحات 948 ، رعایتی قیمت 300 + ڈاک خرچ 50 = کل قیمت 350 روپے

حصہ اول اور حصہ دوم دونوں کی کل رعایتی قیمت مع ڈاک خرچ = 650 روپے

نئے ایڈیشن اور نئی کتابوں کی رعایتی قیمتیں

1	قواعد زبان قرآن حصہ اول (تیسرا ایڈیشن)	خلیل الرحمن چشتی	250 روپے
2	قواعد زبان قرآن (حصہ دوم)	خلیل الرحمن چشتی	300 روپے
3	اسلامی تربیت گاہیں	محمد خان منہاس، چشتی	40 روپے
4	تزکیہ نفس ، مفہوم ، ماہیت اور عملی تدبیریں	محمد خان منہاس، چشتی	50 روپے

تیرہ (13) کتابوں کے مکمل سیٹ کی قیمت مع ڈاک خرچ -/905 روپے ہے
کتابیں وی ۔ پی نہیں کی جائیں گی ۔ منی آرڈر یا ڈرافٹ پہلے آنا لازمی ہے۔

الفوز اکیڈمی ، اسلام آباد
317, Street 16, F-10/2, Islamabad
Tel: 051- 22 51 933
Fax : 051 - 22 54 139

ضرورت رشتہ

تنظیم اسلامی کے رفیق جو کہ ایک سرکاری افسر ہیں‘ کی صاحبزادی‘ عمر ۲۲ سال‘ تعلیم انٹرمیڈیٹ‘ امور خانہ داری کی ماہر‘ بچوں کو گھر پر دینی تعلیم دینے میں مصروف‘ کے لئے رشتہ درکار ہے۔ اردو بولنے والے دیندار والدین/سرپرست رابطہ فرمائیں:

رابطہ: سید فضل الحق‘ معرفت دفتر تنظیم اسلامی

اسلام چوک‘ اورنگی ٹاؤن‘ سیکٹر ساڑھے گیارہ‘ فون (گھر): 021-2578011

قرآن وسنت کی تعلیمات پر مبنی کتابوں کی اشاعت میں

ایک امتیازی مقام کے حامل ادارے

نور اسلام اکیڈمی لاہور

کی چند اہم مطبوعات

غلطیوں کی اصلاح کا نبوی طریق کار
تالیف: الاستاذ محمد صالح المنجد
ترجمہ و تفہیم: مولانا عطاء اللہ ساجد
صفحات: 148، قیمت: 60 روپے

اللہ کے ہاں حرام، بندوں کے ہاں آسان
تالیف: الاستاذ محمد صالح المنجد
ترجمہ و تفہیم: عبدالرشید بن عبدالرحمٰن
صفحات: 160، قیمت: 66 روپے

حقیقت واقسام توبہ
تالیف: شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ
ترجمہ و تفہیم: مولانا بشیر احمد حامد حصاری
صفحات: 160، قیمت: 66 روپے

حقیقت وسیلہ
حاصل مطالعہ از قلم:
مولانا مقصود الحسن فیضی
صفحات: 176، قیمت: 72 روپے

جنت اور جہنم کی راہیں
پیشکش: دار ابن مبارک، الخبر
ترجمہ و حواشی: ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور
صفحات: 160، قیمت: 66 روپے

بربادئ اعمال کے اسباب
تالیف: سُلیم بن عید الہلالی
ترجمہ و تفہیم: عبدالعلیم نور العین السلفی
صفحات: 60، قیمت: 27 روپے

بامقصد عملی موضوعات، بہترین کمپیوٹر کمپوزنگ، آیات واحادیث کے مکمل اعراب وحرکات اور مفصل حوالہ جات، تصحیح اغلاط کا خصوصی اہتمام، دیدہ زیب رنگین ٹائٹل، اعلیٰ سفید کاغذ اور معیاری طباعت، نور اسلام اکیڈمی کی مطبوعات کی نمایاں خصوصیات ہیں

مکمل فہرست خط لکھ کر طلب کیجئے

سیل سنٹر: **مکتبہ نور اسلام** رحمن مارکیٹ، اردو بازار لاہور

رابطہ: نور اسلام اکیڈمی، پوسٹ بکس 5166 ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5884789

KT

KHALID TRADERS

NATIONAL DISTRIBUTORS

NTN

BEARINGS

IMPORTERS - INDENTORS - STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER - SMALL TO SUPER - LARGE

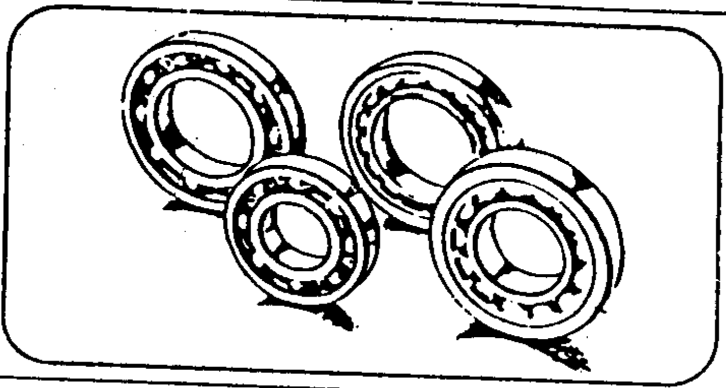

PLEASE CONTACT

Opp. K.M.C. Workshop, Nishtar Road, Karachi-74200, Pakistan.
G.P.O. Box #. 1176 *Phones* : 7732952 - 7730595 *Fax* : 7734776 - 7735883
E-mail : ktntn@poboxes.com

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : ***SIND BEARING AGENCY***, 64 A-65 Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400(Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : 5 - Shahsawar Market, Rehaman Gali No. 4, 53-Nishtar Road, Lahore-54000, Pakistan. Phones: 7639618,7639718,7639818, Fax: (42) : 763-9918

GUJRANWALA: 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING